درِ امکاں پہ دستک

یوسف خالد

دَرِ امکاں پہ دستک

(نثری نظمیں)

یوسف خالد

قائم شدہ
1981ء

سلسلۂ اشاعت: 152

تاریخ اشاعت: ستمبر 2024ء

قیمت: =/800 روپے

کتاب: درِ امکاں پہ دستک

شاعر: یوسف خالد

کمپوزنگ: زین ابوطالب زیدی، ''ماہوزا'' کمپیوٹر کمپوزنگ، فیصل آباد

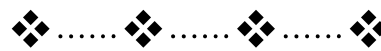
تزئین: علی حسن زیدی

سرِورق: وصی عسکری زیدی، کمیل مہدی زیدی

بائنڈنگ: محمد عمران 0323-7282113

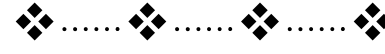
مطبع: زیدی ڈیجیٹل پرنٹنگ، فیصل آباد 0300-6619124

اہتمام: ماہوزا (قائم شدہ 1981ء) اہلِ قلم کا اشاعتی ادارہ، فیصل آباد



ڈاکٹر نذر عابد کے نام

فہرست



دستک سے پہلے

میری نثری نظموں کا پہلا مجموعہ " سمے کا دھارا" کے نام سے 2022 کو شائع ہوا تھا- اس مجموعہ سے پہلے میرے سات شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے جن میں غزلیں، قطعات اور آزاد نظمیں شامل تھیں۔

میں ایک عرصہ تک نثری نظم کو بطور صنفِ شاعری تسلیم کرنے سے گریزاں رہا-سبب اس کا وہی کہ میرے نزدیک بھی عام لوگوں کی طرح شاعری کا روائتی آہنگ ہی شاعری کی پہچان تھا- نثری نظم کے حوالے سے ہونے والے مباحث اور بعض شعراء کی نثری نظمیں میرے زیرِ مطالعہ رہیں-اس کے علاوہ اردو نظم کے ارتقائی سفر پر بھی نظر رہی کہ کیسے اردو نظم نے پابند سے معرا اور پھر معرا سے آزاد نظم کا روپ دھارا- میں بڑی سہولت سے آزاد نظم لکھ رہا تھا لیکن مجھے یہ احساس بھی تھا کہ کہیں نہ کہیں پابند نظم کی طرح آزاد نظم بھی میرے کچھ مضامین اور حسی تجربات کو گرفت میں لینے سے عاجز ہے- میں نے ہمیشہ امکانات کو اپنی فکر کا حصہ بنایا کسی بھی اظہاریے کو یکسر رد نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس کی امکانی صورتیں میرے پیشِ نظر رہیں-اس سب کے باوجود میں نے کبھی بھی شعوری طور پر کسی صنف یا اظہاریے کو اختیار نہیں کیا- جو خیال، سوچ اور تجربہ تخلیقی رو کا حصہ بنا اس نے اپنے لیے صنف کا انتخاب بھی خود کیا- میں نے مقدور بھر اس صنف کے فنی پہلوؤں اور شعری محاسن کے تقاضوں کو پورا کیا-

مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ نثری نظم نے بڑی بے ساختگی سے میرے شعری تجربے کی جزئیات کو سمیٹا اور آگے بڑھتی چلی گئی - یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نثری نظم میری شعوری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ ایک منہ زور لہر کی طرح میرے نظام فکر سے ٹکرائی اور اپنا راستہ بناتی چلی گئی - یہ سلسلہ غیر محسوس انداز میں جاری رہا- اور بالآخر ایک مجموعے کی صورت میں سامنے آیا-

مجھے خوشی ہے کہ اس مجموعہ کی ادبی حلقوں میں بہت پزیرائی ہوئی - قارئین نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا - نثری نظم کی تخلیقی رو اپنی پوری توانائی کے ساتھ میرے تخلیقی تجربے میں شامل ہے میری نثری نظموں کا دوسرا مجموعہ " درِ امکاں پہ دستک" آپ سب کی خدمت میں پیش ہے-

مدیرِ اسالیب ذوالفقار احسن نے فروری 2024 میں " سمے کے دھارا" پر لکھے گئے (17) نامور ناقدین کے مضامین کو درج ذیل عنوان کے تحت یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا۔

''نقد و نظر'' یوسف خالد کی نثری نظمیں (نامور ناقدین کی نظر میں)

سمے کا دھارا کی نظموں پر چند ناقدین کی آراء:

" سمے کا دھارا کی نظمیں اس لحاظ سے بھی منفرد ہیں کہ یوسف خالد نے زندگی کے مختلف کرداروں اور ان کے طرزِ حیات پر غور کرتے ہوئے یہ جستجو کی ہے کہ وقت کسی فرد کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے یا مختلف افراد وقت کے دھارے کا سامنا کس انداز میں کرتے ہیں اس مجموعہ میں کرداروں کو دیکھیں تو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے

لے کر طبقات اور اصناف تک ایک نگار خانہ نظر آتا ہے اور ہر تصویر وقت کی ضربوں سے ایک الگ انداز سے متاثر نظر آتی ہے۔ کوزہ گر، مصور، واقعہ نگار اور کہانی کار ایسے کرداروں کے علاوہ کوئی معصوم بچہ، کسی گھر کا کوئی محنت کش سربراہ، کسی کھیت میں موسم کا جبر سہتا کوئی کسان یا دفتر کی فائلوں کے انبار تلے سانسیں بحال کرتا کوئی کلرک۔ یہ سب ایسے کردار ہیں جو یوسف خالد کی نظموں میں وقت کا سامنا کرتے ہوئے بقا کی جنگ میں مصروف نظر آتے ہیں۔ دلچسپ امر ہے کہ نظموں کے یہ کردار کسی کلفت میں گھرے اداس بھی ہیں لیکن وقت کے اٹل فیصلوں کو قبول کرتے ہوئے مسکراتے بلکہ سرشار ہوتے بھی دکھائی دیتے ہیں"

ڈاکٹر طارق ہاشمی اسی مضمون میں مزید لکھتے ہیں" ایک تخلیق کار کئی دہائیوں تک اپنے خامے سے حرف و معنی کے نقوش تراشتا ہے اور برسوں بعد وقت سے مکالمہ کرتے ہوئے اپنے سفرِ حیات کا تجزیہ کرتا ہے تو ماضی کی تاریکیوں میں گم ہو جانے والی منزلیں شاید اتنی اہمیت نہیں رکھتیں کہ اس کے تخلیقی باطن میں ایک مرغزار آباد ہو چکا ہوتا ہے۔ سمے کا دھارا کی نظمیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ یوسف خالد کے باطن میں بھی متنوع تخلیقات کے رنگ و رس سے معمور ایک باغِ جاں فزا ہے جس کے معطر ماحول میں "ھم فیھا خالدین" کی ابدی سرشاری کی آرزو جگمگا رہی ہے"

(ڈاکٹر طارق ہاشمی کے مضمون سے اقتباس)

ڈاکٹر **یونس خیال** نے سمے کی دھار میں شامل نظموں پر یوں اظہارِ خیال کیا:

"یوسف خالد کے ہاں تخلیقی توانائی اس قدر زیادہ اور منظّم ہے کہ وہ کسی بھی

شعری صنف میں ڈھلے اپنی انفرادیت سے قاری کو سرشار کرنے کی اہلیت رکھتی ہے لہٰذا فکری اظہار کے لیے نثری نظم کا چناؤ اس کا لاشعوری عمل ہے-اس نے نثری نظم کے مزاج، اس کے موضوعات اور اس کی لفظیات کو اتنے سلیقے اور ہنرمندی سے تخلیقی صورت عطا کی ہے کہ نثری نظم کی داخلی توانائی اور تاثیر پڑھنے والے کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ یہ نظمیں اس کی آزاد نظم سے الگ وجود کا اظہار کرتی ہیں اور ان نظموں نے نثری نظم کے وقار میں اضافہ کیا ہے ان نظموں کے مضامین اور ٹریٹمنٹ متاثر کن ہے-
(اقتباس)

ڈاکٹر نذر عابد لکھتے ہیں:

یوسف خالد کے ہاں زندگی کے روشن، اجلے اور مثبت رویوں کی ترجمانی ہی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس نے ان کی نثری نظموں میں تخلیقی رنگارنگی کا وہ داخلی آہنگ بھر دیا ہے جس نے ان کے فن کو ایک اعتبار بخشا ہے۔ان کی نثری نظموں میں زندگی بھرپور معنویت کے ساتھ مختلف زاویوں سے طلوع ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ایک ایسی زندگی جس کے کینوس پر ارتقا اور امکانات کے بے پناہ رنگ اپنے خاص تناسب اور توازن کے ساتھ بکھرے پڑے ہیں۔ یوسف خالد نے اپنی نثری نظموں کی صورت میں ایسا شعری سرمایہ تخلیق کیا ہے جو انھیں ایک ایسے سچے اور کھرے فن کار کے روپ میں سامنے لاتا ہے جو زندگی کے مختلف رنگوں سے بھی جڑا ہوا ہے اور اپنے لوگوں اور اپنی مٹی سے روحانی وابستگی سے بھی سرشار ہے۔ یوسف خالد یقینی طور پر نثری نظم کے ایسے خلاق شاعر ہیں جنھوں نے اس شعری صنف کی توانا روایت کو آگے بڑھانے میں بہت اہم نوعیت کا کردار ادا کیا ہے۔ (اقتباس)

ڈاکٹر سمیرا اکبر لکھتی ہیں:

یوسف خالد فطرت کے دل موہ لینے والے نظاروں کے ناپید ہونے پر نوحہ کناں ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ہماری تیز رفتاری اور نام نہاد ترقی کی وجہ سے قدرت ہم سے روٹھ گئی ہے۔انسان نے اسی برق رفتاری کی خاطر قدرت کے نظام کو درہم برہم کر دیا ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مٹی کا نم ہم سے روٹھ گیا ہے۔کھیت ویران ہوتے جا رہے ہیں۔درختوں کی تیزی سے کمی کی وجہ سے ٹھنڈی میٹھی چھاؤں اور پرندے ہم سے روٹھ گئے ہیں۔اسی باعث ہمیں کئی طرح کی موسمیاتی تبدیلیوں اور زمینی وسماوی آفات کا سامنا ہے۔(اقتباس)

میں اپنے تمام قارئین اور ناقدین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے نثری نظموں کے پہلے مجموعہ ''سمے کا دھارا'' کی نظموں کا پوری توجہ سے مطالعہ کیا اور انہیں سراہا،اب میری نثری نظموں کا دوسرا مجموعہ ''درِ امکاں پہ دستک'' آپ کے ہاتھوں میں ہے،امید ہے اسے بھی توجہ اور پزیرائی ملے گی۔

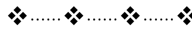
یوسف خالد

مَیں نے جینے کا ہُنر سیکھ لیا ہے

ایک مدت کے بعد
آج صبح میں نے لان کی شبنمی نرم گھاس پر
ننگے پاؤں چلنا شروع کیا تو مجھے یوں لگا
گھاس کی بے ضرر نوکیلی وابستگی میں
ایک جادو ہے
ایک سرشار کردینے والی لطیف سی لہر
میرے پورے بدن میں پھیل گئی
وقت کا بہاؤ اتنا تیز نہیں تھا
زندگی میں ایک ٹھہراؤ تھا
فطرت اپنی تمام تر رعنائیوں کے سنگ
صبح اٹھنے والوں کا استقبال کرتی تھی
پھولوں، کلیوں اور سبزے کی پلکوں پر
اوس قطروں کی جھلملاہٹ

پرندوں کی چہکاریں،
بادِ صبا کا خرام اور نیم روشن ماحول
صبحِ نو کی قدم بوسی کے لیے
صف بندی کرتے نظر آتے تھے
کھیتوں میں چلتے ہوئے ہل
سوئی ہوئی زمین کا غلاف اتارتے تھے
کسان ننگے پاؤں مٹی کے لمس سے
تازگی ،توانائی اور آرزوئیں سمیٹ کر
اپنے دن کا آغاز کرتا تھا
گھروں کے آنگن
دودھ ایسی ناریوں کے دودھ بلونے
اور زیرِ لب گنگنانے سے مہک اٹھتے تھے
یہ کل کی بات ہے
اس تیز رفتا سماج میں نئ پود ان ذائقوں سے نا آشنا ہے
المیہ یہ ہے کہ اس عہد میں
تصویروں اور آوازوں کی یلغار نے
فرد سے انہماک چھین لیا ہے
تصور اور متخئیلہ کو کمزور کر دیا ہے

اوسط درجے کے ذہنوں کو
کسی حیرت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا
راحتیں کمائی نہیں جارہیں خریدی جارہی ہیں
اسی سبب سے فرد پر راحت کے معنی نہیں کھلتے
سورج نکل آیا ہے
اس کی تیز کرنوں نے مجھے
اپنے کمرے کی جانب دھکیل دیا ہے
میں نے ہیر وارث شاہ کی ورق گردانی شروع کردی ہے
کھڑی شریف کی دانش اور باہو کی ہُو نے
مجھے اپنے حصار میں لے لیا ہے
سورج دیوتا کو نہیں پتا کہ میں اس کے آنے سے پہلے پہلے
اپنے حصے کا رزق سمیٹ چکا ہوں
میں نے دھرتی کے لمس کو نئی اپنائیت سے
اپنے وجود میں اتارنے کی ریاضت شروع کردی ہے
میں نے جینے کا ہنر سیکھ لیا ہے

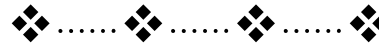


استعارہ

ہماری آنکھ
ہمہ وقت روشنی کی طلبگار رہتی ہے
بند ہوتی ہے
تو بھی اپنے اندر کوئی دیا جلا لیتی ہے
جب روشنی مناظر کی جزئیات کو نمایاں کرتی ہے
تو آنکھ میں نصب آئینہ بیدار ہو جاتا ہے
مناظر کی اوٹ سے آگہی کا ظہور ہوتا ہے
روشنی روشنی کے روبرو آتی ہے
تو اطراف میں اجالے پھیل جاتے ہیں
آنکھ کے اندر
ایک سفید خیمہ نصب ہے
سفید رنگ روشنی کو جذب نہیں کرتا
پھیلا دیتا ہے

خیمے کے اندر مختلف رنگوں کا حسن
جلوہ گر رہتا ہے
جب کبھی ناظر
زندگی کے رنگوں سے شناسا ہونے کا ارادہ کرتا ہے
تو چلمن کے پیچھے سے
سرخ، نیلا اور سبز رنگ جھانکنے لگتے ہیں
ایک قوسِ قزح تشکیل پاتی ہے
تو طفیلی رنگ بھی متحرک ہو جاتے ہیں
اپنی چہرہ کشائی کرتے ہوئے یہ رنگ
سفید رنگ سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہیں
متنوّع کیفیات کو اعتبار بخشتے ہیں
مگر کسی صورت پاکیزگی، سلیقے اور اجلے پن کو تج نہیں کرتے
پلکوں پر لرزتے ہوئے آنسو
اور پھولوں کی پتیوں پر ٹھہرے ہوئے اوس قطرے
ایک جیسا مقدّر رکھتے ہیں
رنگوں کی اس برکھا میں
بھیگتے ہوئے کردار
سفید اوڑھنی اوڑھے ہوئے رہتے ہیں

ان کے جذبے، ان کی آرزوئیں
ان کی امیدیں اور ان کے خواب
سفید خیمے کی وسعتوں میں ایک ساتھ رہتے ہیں
گھٹن محسوس کرتے ہیں نہ بے گانگی
ایک باہمی کشش رنگوں کو
طلبگاری کی ہماہمی سے سرشار رکھتی ہے
سفید رنگ
سیاہ رنگ کی لوح پر اجالے کا نقیب
اور رنگوں کے تنوّع کا استعارہ ہے
خلوت کدے کا بھید ہے

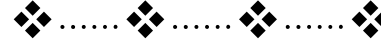


نمودِ سحر

دیکھو!
میں نے اب یہ اچھی طرح سوچ لیا ہے
کہ یوں ہی گم صم رہ کر
اور کچھ نہ کہہ کر
مجھے اب خود کو امن پسند ثابت نہیں کرنا
مجھے اس تاریک رات میں نمودار ہوتے ہوئے
جگنوؤں کا استقبال کرنا ہے
مجھے نیند کا غلاف اتار کر
اپنی آنکھوں میں بیداری بھرنی ہے
بہت سو لیا
اب اور کتنا سونا ہے
میری غفلت، سستی اور نا اہلی و کم ہمتی کی وجہ سے
نیا دن طلوع ہونے سے ہچکچا رہا ہے

پرندے گھونسلوں میں پڑے پڑے اڑنا بھول گئے ہیں
ننھی چڑیاں میری کھڑکی پر بار بار دستک دیتی ہیں
مایوس ہو کر لوٹ جاتی ہیں
میں اب زیادہ دیر تک
ان دستکوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا
میں نے بستی والوں کو پیغام بھیج دیا ہے
ہمیں ہر حال میں جگنوؤں کے ساتھ مل کر
رات کو پسپا کرنا ہے
سورج دیوتا سے اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگنی ہے
اسے طلوع ہونے کے لیے راضی کرنا ہے
پوری فضا ہماری سرگوشیاں سن رہی ہے
ہواؤں نے اپنے دامن میں خوشبوؤں کو سمیٹ لیا ہے
ہر سو لبیک لبیک کی آوازیں آ رہی ہیں
پہلی بار رات کے ماتھے پر پسینہ دیکھا ہے
بے قراری اور بے چینی دیکھی ہے
دور افق کے کنارے سے شفق کو جھانکتا دیکھا ہے
ملگجی ماحول جنم لے چکا ہے
زندگی نے ایک بھرپور انگڑائی لی ہے

اوس قطروں سے غسل کی شروعات ہو چکی ہیں
آئینہ خانہ میں خوش لباسی محوِ انتظار ہے
طویل شب پسپا ہو رہی ہے
فطرت نے نمودِ سحر کا اعلان کر دیا ہے
گجر بجا دیا ہے



دھیان کی بے سمتی

میں کئی دنوں سے ایک اضطراب کی کیفیت میں ہوں
بظاہر کوئی سبب نہیں
لیکن ایک مسلسل بے دلی نے جکڑا ہوا ہے
خدا معلوم یہ بھید کیسا ہے
اور یہ اُلجھن کیسی ہے
میں نے کمرے کی کھڑکیاں کھول دی ہیں
پردہ ہٹا دیا ہے
دائیں جانب میز پر پڑی تصویر اور ڈائری بھی اٹھا کر
الماری میں رکھ دی ہے
میں اپنے بکھرے ہوئے دھیان کو سمیٹنے کی کوشش میں ہوں
بہت ممکن ہے میری بے قراری کو قرار آئے
زندگی یوں تو ہمیشہ سے ہی مجھ سے گریزاں رہی ہے
مگر ان دنوں اس کا رویہ بڑا تشویش ناک ہے
ایک بے نام سی چبھن ہے ایک رائگانی کا شدید احساس ہے

جس نے مجھے منفعل کر دیا ہے
مجھے لگتا ہے جیسے میں کسی ویران گھر میں ہوں
میرے کمرے کے ایک کونے میں تنہائی اور دوسرے میں
اداسی نے قبضہ جمایا ہوا ہے
کھڑکی سے آنے والی ہوا بھی ڈری ڈری سی لگتی ہے
میں خود کو ریزہ ریزہ ہوتا ہوا محسوس کر رہا ہوں
یوں لگتا ہے جیسے کسی صحرا نے میرے اندر بسیرا کر لیا ہے
ایک تپش آمیز منظر آنکھوں میں ٹھہر گیا ہے
پیاس سے بے حال ہوں
سوئے آسماں نظر ہے
کہ کہیں کوئی ابر کا بھٹکا ہُوا ٹکڑا
ادھر کا رُخ کرے
جب صحرا اندر اتر جائے تو
نمو کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں
مگر اس حال میں بھی میری آنکھیں
ابر کی صورت
برسنے کے لیے بے تاب ہیں

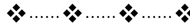
❖......❖......❖......❖

اُلجھی کہانی کا سِرا

جستجو لاحاصلی سے خوف زدہ نہیں ہے
کئی بار رائیگانی کے احساس نے
میرے بڑھتے قدموں کو روکنے کی کوشش کی ہے
دل کے کسی عمیق گوشے میں
ایک سراغ رساں چھپا بیٹھا ہے
جو ہر صبح ایک نئے امکان کے کھوج میں نکلتا ہے
کچے راستوں پر چلتا
بل کھاتی پگڈنڈیوں سے گزرتا ہوا
ایک گھاٹی میں جا اترتا ہے
نشیب اور فراز کے تعلق پر غور کرتا ہے
بائیں جانب ایستادہ سیاہ پیکر کہسار کے دامن میں
ایک غار کے دہانے پر خیمہ لگاتا ہے
سانسیں درست کرتا ہے

غار میں اترنے کے لیے خود کو مجتمع کرتا ہے
غار کے دہانے پر گدلے جالے کی ایک جھالر لٹک رہی ہے
جو بصارت کے رستے میں حائل ہے
بتانے والے نے بتایا تھا
کہ اس غار میں ان گنت کہانیوں کے آثار بکھرے پڑے ہیں
کہانیوں کی کشش نے سراغ رساں کو یہاں لا کھڑا کیا ہے
اس بار میں نے بھی
خود کو اس کھوج کے لیے آمادہ کیا ہے
سراغ رساں کے پیچھے پیچھے غار تک آ پہنچا ہوں
غار کے اندر تاریکی ہے
گہری تاریکی
مجھے اپنی کہانی کا سرا تلاش کرنا ہے
میری زبان پر ایک اسم کا ورد جاری ہے
میری بصارت عرفان و آگہی کے نور سے روشن ہوتی ہے
تاریکی چھٹنے لگتی ہے
تو غار کے اندر پیچ در پیچ راہداریوں میں
دور تک بکھری ہوئی کہانیوں کی قاشیں
میرے تجسّس کا سواگت کرتی ہیں

مجھے اپنی کہانی کا سرا تلاش کرنا ہے
بصارت بصیرت کو آواز دیتی ہے
تو ایک اجلی تہذیب کا شعور میرے اندر لو دینے لگتا ہے
میں اپنی کہانی کی جزئیات سمیٹنے لگتا ہوں
غار کی مٹیالی دیواروں پر لکھی کتھا کی زبان ادق ہے
میں غار سے نکلتا ہوں
اور خود میں اتر جاتا ہوں
اپنے آپ کو اپنے روبرو لاتا ہوں
کہانی سے ہم رشتہ ہو کر
کسی صاحبِ جمال آئینہ بیں کی طرح
پہلی بار خود پر منکشف ہوتا ہوں

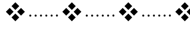


وصل ایک بہاؤ ہے

ایک کوندا ہے
جو روحوں کی ہم رشتگی سے جنم لیتا ہے
روشنی لپکتی ہے
اور درمیانی فاصلے کو مٹا کر
ایک رو میں بدل دیتی ہے
جسموں میں سرایت کرتا ایک لطیف احساس
اس رو کا ہاتھ تھام لیتا ہے
کوندے کی چمک
ایک انجانی بے قراری کو لطف و انبساط سے آشنا کرتی ہے
روحیں اپنے تمام پیغامات اس خفیف رو کے ذریعے
ایک طاقت ور نظام کو پہنچاتی ہیں
بادل گرجتا ہے
شور اور کوندا ایک ساتھ نمودار ہوتے ہیں

تو ہوا اٹھکیلیاں کرنے لگتی ہے
گھٹائیں ہوا کے رتھ پر سوار پیاس بجھانے کے لیے نکلتی ہیں
تو نواحِ جاں میں کیفیات رقص کرنے لگتی ہیں
بادل کے ٹکڑے مجتمع ہونا شروع ہوتے ہیں
تو ایک بھیدوں بھرا اندھیرا منظر کو ڈھانپ لیتا ہے
بادل برستا ہے
پیاس کروٹیں لیتی ہے کبھی بڑھتی ہے کبھی کم ہوتی ہے
ختم نہیں ہوتی
راحت کدوں کی مسحور کن روشنی
کوندے سے معانقہ کرتی ہے
تو ماحول میں روشنی تقسیم ہونا شروع ہو جاتی ہے
وصل کے یہ مختصر سے لمحے
ایسی کہانیوں کی بنیاد رکھتے ہیں
جنہیں صدیاں سینت سینت کر اپنے وجود میں رکھتی ہیں
اور پھر نسل در نسل
تسلسل سے ان کہانیوں کو منتقل کرتی چلی جاتی ہیں
وصل ایک بہاؤ ہے

جسے فراق کی آڑ کا سامنا رہتا ہے
یہی آڑ اسے توانائی بھی فراہم کرتی ہے
اور یہی آڑ اسے مستقل بے تابیاں بھی دان کرتی ہے
بہاؤ کے لیے کوندے کا ظہور بہت ضروری ہے

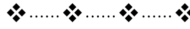


پسِ چلمن

جب توازن بگڑتا ہے
تو اپنے اپنے مرکز کے گرد
اپنے اپنے دائروں میں رقص کرتے ہوئے رقاص
یوں لڑکھڑانے لگتے ہیں
جیسے پتنگ باز کے ہاتھ سے ڈور ٹوٹ جانے کے بعد
پتنگ ہوا میں لڑکھڑاتا ہوا
بے سمتی کا شکار ہو جاتا ہے
یہ توازن ایک ایسی کھینچا تانی سے وجود میں آتا ہے
جہاں متخالف قوتیں مسلسل تناؤ میں رہتی ہیں
شکست تسلیم نہیں کرتیں
یہی سبب ہے کہ کائنات کا مجموعی مزاج
توازن کی حفاظت کرتا ہے
زندگی میں بعض کردار

رقص کی یکسانیت سے اکتا جاتے ہیں
تو بغاوت پر اتر آتے ہیں
دائرے کو توڑتے ہیں
نظام کو تہہ و بالا کرتے ہیں
نئے مراکز تلاش کرتے ہیں
نئی صف بندی کرتے ہیں
ایک طویل یدھ شروع ہوتا ہے
تشکیل اور ردِ تشکیل کے عمل میں
مخالف قوتیں
شراکت کے نئے فارمولے پر دستخط کرتی ہیں
پھر سے رقص شروع ہو جاتا ہے
نیا منظر نامہ ابھرتا ہے
جڑنے اور ٹوٹنے کا جنوں
زیریں سطح پر انگڑائیاں لینے لگتا ہے
سطح پر پھول کھلتے ہیں خوشبوئیں پھیلتی ہیں
ملن کے گیت لبوں تک آتے ہیں
آنکھوں میں ڈورے
اور پلکوں پر سپنے جھلملانے لگتے ہیں

زندگی نئے موسموں کا سواگت کرتی ہے
عشّاق رقص آمادہ ہوتے ہیں
دائروں کا وجود پھر سے خطرے میں پڑ جاتا ہے
کہانی خود کو دہراتی چلی جاتی ہے
مورخ کو اپنا رزق اکھٹا کرنے میں
کوئی دشواری پیش نہیں آتی
ٹوٹنے، جڑنے
توازن اور عدم توازن کے اس کھیل میں
کیسی کیسی سرشاریاں جنم لیتی ہیں
کیسے کیسے کنج آباد ہو جاتے ہیں
یہ سارے بھید گہرے انہماک
اور درِ احساس پر سجدہ ریز ہوئے بغیر نہیں کھلتے

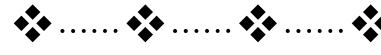


مَیں خود ایک آئینہ ہوں

اس حیرت کدہ میں
ہر حیرت ایک مہا حیرت سے جڑی ہوئی ہے
میں اکثر آئینے کے روبرو جب تھوڑی دیر کے لیے
اپنے شعور کی رو کو مدھم کرتا ہوں
تو کوئی نہ کوئی حیرت مجھ پر اترنے لگتی ہے
میری آنکھیں سب سے پہلے
حیرت کا سواگت کرتی ہیں
میری نگاہیں آئینے پر جم جاتی ہیں
جیسے جیسے میرا انہماک بڑھتا ہے
نقاب اترنے لگتا ہے
آنکھیں حیرت کی تصویر اتارتی ہیں
اور آگہی کے فریم میں سجا کر مجھے پیش کر دیتی ہیں

اس سمے
میں پورے کا پورا پوترتا کی دھند میں بھیگ جاتا ہوں
مجھے یوں لگتا ہے میں نے ایک جست لگائی ہے
ایک دوسرے کنارے کو مس کیا ہے
ایک اور حیرت میری طرف لپکی ہے
مجھے کشادگی کا احساس ہونے لگا ہے
میں نے آئینہ خانے میں اپنا قیام بڑھا دیا ہے
مجھے یوں لگتا ہے
بہت جلد میں آئینہ بن جاؤں گا
میں اس لمحے کے انتظار میں ہوں
مجھے معلوم ہے کہ جب میں
ایسی حالت میں آئینے کے روبرو آؤں گا
تو حیرتوں کا لامتناہی سلسلہ وجود میں آئے گا
ہر حیرت اپنی مخصوص فریکوئینسی سے
مجھ سے ہم کلام ہو گی
حیرتوں کے ریشمی پیرہن کو مس کرنے سے
ایک برقی رو میرے وجود میں سرایت کر جائے گی
اور میں زمین کی کشش سے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا

مجھے نہیں معلوم کتنی کہکشائیں
میرے انتظار میں ہیں
کتنے دودھیا راستوں پر اجلی رفاقتیں پھولوں کے گلدستے لیے
میرا استقبال کرنے کو بے چین ہیں
میں نے خود کو صیقل کر لیا ہے
اب میں خود ایک آئینہ ہوں
محبت میرے روبرو آ کر مجھ میں
خود کو پوری طرح دیکھ سکتی ہے
میں محبت کا احسان مند ہوں
میرا سفر رائگاں نہیں گیا

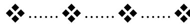


ٹیڑھ

سب کچھ معمول کے مطابق تھا
سڑکوں پر شور مچاتی دھول اڑاتی گاڑیاں
تجارتی مراکز میں بڑی بڑی توندوں والے سیٹھ
سودے طے کرنے میں مصروف تھے
بازاروں اور دکانوں میں
خواہشیں راہگیروں کا دامن کھینچ رہی تھیں
دفاتر میں فرعون بنے افسر
سائلوں کی فائلوں سے کھیل رہے تھے
پسِ پردہ مجبور و بے کس مخلوق کی قسمت کے
فیصلوں کی قیمت لگ رہی تھی
عدالتوں کے چکر لگاتی زندگیاں
ذلت و رسوائی سمیٹ رہی تھیں
دھماکہ ہوا

سب کچھ تہہ و بالا ہو گیا
ڈاکٹر کہہ رہے تھے اسے لے جائیں
اس کا دماغ شدید متاثر ہوا ہے
اسے مسلسل آرام اور اچھی خوراک کی ضرورت ہے
اسے نارمل ہونے میں کافی عرصہ لگے گا
یہ ذہنی و فکری انتشار
یہ کج بحثی، یہ تکرار
یہ بے سمتی اور پیہم ٹکراؤ
کہیں یہ بھی کسی عظیم دھماکے کے سبب تو نہیں ہے
کیا ہم ابھی تک
اس عظیم دھماکے کے آفٹر شاکس کی
زد میں ہیں
اور کیا ہمیں بھی نارمل ہونے میں طویل عرصہ لگے گا
اور کیا ہمیں بھی مسلسل آرام
اور اچھی خوراک کی ضرورت ہے
سب کچھ کیسے معمول پر آئے گا
آرام ناپید ہے
اچھی خوراک بس ایک تصور ہے

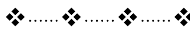
ہم نے ہر شے کو ملاوٹ کے زہر سے آلودہ کر دیا ہے
مسلسل شور اور ہنگامہ انگیزیوں نے ہمارے لیے آرام
ناممکن بنا دیا ہے
یوں لگتا ہے
دھماکے کی زد میں ہمارے دماغ ہی نہیں آئے
ہمارے خواب، ہماری آرزوئیں
ہماری سماجی قدریں
سب کچھ خلط ملط ہو گیا ہے
ہمارا اجتماعی شعور بری طرح متاثر ہوا ہے
ہم کب نارمل ہوں گے
کیا کبھی ہو بھی پائیں گے؟



خود فراموش

وقت ریل گاڑی کی طرح
مناظر کے ہجوم کو چیرتا آگے بڑھتا جاتا ہے
نہ رفتار کم کرتا ہے نہ رکتا ہے
میرا احساس اس منہ زور وقت کی یلغار کو کم کر سکتا ہے
میں اس کے ایک ایک لمحے سے
اپنے ہونے کا خراج وصول کر سکتا ہوں
محبت کا حریری لمس
سندر آرزوؤں اور خوبصورت خوابوں کو جب وقار بخشتا ہے
تو صحنِ جاں میں کسی کی دل نواز آہٹ محسوس ہونے لگتی ہے
میں نے کئی بار
پہلو بدلتی اپنائیت سے معانقہ کیا ہے
گریز پائی کو ملتفت ہونے کی ترغیب دی ہے
وابستگی کو خوشبو میں ڈھلتے دیکھا ہے

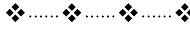
بے چہرگی کو گیت کے بولوں میں سوم رس انڈیلتے محسوس کیا ہے
مدھ بھری آنکھوں میں موجود بے نیازی کو
آمادہءِ نیاز دیکھا ہے
میں کیسے کہہ دوں کہ جذبے گنگ ہوتے ہیں
حسن شفاف ندی کی طرح ہوتا ہے
دیکھنے والی نظر تہہ تک اتر کر
تصویریں بنانے لگتی ہے
یہ تصویریں جامد نہیں ہوتیں
کلام کرتی ہیں
اور احساس کو متشکل کرتی ہیں
میں نے کئی بار رات کے پچھلے پہر
حسن کو تجسیم ہوتے دیکھا ہے
اس کے خال وخد اور بدن کے زاویوں سے حظ اٹھایا ہے
میں مناظر کی بھیڑ میں بھی
اس پیکرِ خود فراموش کو احاطہءِ تصور میں لانے کا ہنر جانتا ہوں



رقص کرتے رہو

ابھی لوٹا ہوں
ایک ایسے سفر سے واپسی ہوئی ہے
جہاں راستوں کی بھیڑ میں
بے سمتی کا جنگل اگا ہوا تھا
مسافر کے مقدر میں تھکن اور رائگانی کے احساس کے سوا کچھ نہ تھا
پر پیچ راستوں میں سمتیں گم ہو گئی تھیں
فاصلہ طے ہوتا تھا مگر کم نہیں ہوتا تھا
ایک حیرت مسلسل پیچھا کرتی تھی
شاید یہ دائرے کا سفر تھا
ہر قدم پہلے سے اٹھائے گئے قدموں پر پڑتا تھا
ہر نئی صبح قدم بہ قدم
ایک نئی صبح تک کا سفر کرتی
اور پھر گزشتہ صبح کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوتی

مسافر کسی حیرت کدے میں تھا
دائرے کا سرا نہیں ملتا تھا
سرا ملتا تو سفر مکمل ہوتا
تھکن سے چور مسافر کی آنکھ لگی
تو اس پر کھلا
کہ حاصل کا تصور وہم ہے
جستجو اور سفر ہی اصلِ حیات ہے
دائرہ ٹوٹا تو سفر رک جائے گا
رقص تھم جائے گا
انتشار اور ٹکراؤ سب کچھ ختم کر دے گا
دائرے کو ٹوٹنے نہ دو
رقص کرتے رہو



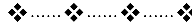
ان کہی کہانیاں

مجھے جب کبھی اذنِ حاضری دان ہوتا ہے
اور میں
اپنے احاطہءِ خیال میں قدم رکھتا ہوں
ایک نیا جہان میرا منتظر ہوتا ہے
یہاں کے شہر الگ ہیں
گلیاں الگ
موسم اور خوشبوئیں الگ ہیں
یہاں کے مکین سارے کے سارے بے ضرر ہیں
میں پہروں ان سے باتیں کرتا ہوں
ان سے کہانیاں سنتا ہوں
تہذیبوں کے پھلنے پھولنے اور مٹنے کی کہانیاں
انہیں سب کچھ ازبر ہے
اگر کچھ بھول جائے تو یہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہیں

ایک تاریک کمرے کا دروازہ کھولتے ہیں
اور روشن فائلیں لا کر مجھے پیش کر دیتے ہیں
کہیں سرگزشتِ آدم کی کترنیں ہیں
کہیں فرعون کا قصہ رقم ہے
کہیں آدمِ ثانی کی روداد ہے
کہیں کوہِ طور پر ہوئے مکالمے کا ذکر ہے
میں ان سے سب قصے کہانیاں لے کر جب پلٹتا ہوں
تو میری زنبیل بھری ہوئی ہوتی ہے
میں بوجھل قدموں سے
اپنے سامنے دم توڑتی ہوئی سماجی قدروں
بے ہنگم آوازوں کے شور، ٹکراؤ
بے سمتی
تیز رفتاری اور لایعنیت کی ہولناکیاں دیکھ کر
واپس لوٹ جانا چاہتا ہوں
مگر میں کیا کروں دروازہ بند ہو چکا ہوتا ہے
اب کب کھلے گا کیا خبر
خدا معلوم کب تک مجھے
اس چیختی چنگھاڑتی زندگی سے نباہ کرنا پڑے گا

میری کل کائنات میری زنبیل ہے
جسے سینے سے لگائے
میں گزشتہ کو موجود سے ہم رشتہ کر کے
نئی کہانیاں لکھتا رہتا ہوں
میری کہانیوں کے کردار
خود فریبی میں مبتلا ہیں
کتنے بے خبر ہیں
اپنے انجام سے سے بے فکر
میں سوچتا ہوں کیا میں انہیں گزشتہ سے منسلک کر کے
کوئی نیا منظر نامہ تخلیق کر سکتا ہوں
کیا صدیاں گزرنے کے بعد بھی
انسانی سوچ جمود کا شکار رہے گی
کیا مجھے عمر بھر رائگانی رقم کرنا پڑے گی
کیا کائنات کا متن کبھی ڈی کوڈ نہیں ہو پائے گا
میں اپنے خدشات ساتھ لیے بار بار
بند دروازے پر دستک دیتا ہوں
مجھے معلوم ہے پسِ در
کن فیکون کی صدائیں مسلسل میرے انتظار میں ہیں

مجھے ایک بار پھر سے ان راہداریوں میں گھوم پھر کر
ازلی صداقتوں کا کھوج لگانا ہے
کہ میرے عہد کو میری ریاضت کے باثمر ہونے کا یقین ہے
اور مجھے بھی دروں بینی کی اہمیت کا ادراک ہے

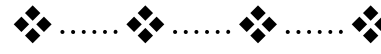


دوسرے کنارے سے

طویل ہجر اور انتظار کے بعد
یہ وصل کے لمحات ہیں
شام کی آنکھوں میں کاجل ہے
چہرہ گلنار ہے
پلکوں پر شکر گزاری کی نمی
اوس قطروں کی سی تازگی لیے
روح میں اترتی جا رہی ہے
مسافر اپنا سارا کروفر
نیاز مندی کی چوکھٹ پر قربان کر چکا ہے
ایک گہرا سکوت
ہم رشتگی کا استقبال کر رہا ہے
پرندوں کی ڈاریں بغیر شور کیے
سلامی دیتی ہوئی گزر رہی ہیں

دریا کی منہ زور لہروں میں
اعتدال کی رَو شامل ہو چکی ہے
بہاؤ میں شانتی اور وقار رچ بس گیا ہے
کہسار کی ہیبت نے پراسراریت اوڑھ لی ہے
درختوں کے لمبے سائے دم توڑ چکے ہیں
جگنوؤں کے کارواں
مقامِ اتصال کی جانب رواں ہیں
ایک ملگجی فضا کو نیم روشن دیوں کی ضرورت ہے
ہوائیں خراماں خراماں جہاں بھر کی خوشبوئیں لیے
ماحول کو معطر کرنے آ رہی ہیں
فطرت نے وصل کو بامعنی بنا دیا ہے
وابستگی و سپردگی کو مفہوم دے دیا ہے
لب بستگی کے نیم وا ہونٹوں پر
ایک خفیف سی لہر ابھری ہے
سرگوشی ایک مدھر سر میں بدل رہی ہے
ملن کے گیت ہونٹوں تک آنے لگے ہیں
شام فرطِ مسرت سے کھل اٹھی ہے
عارض و لب کی عنابی چھب نے

ماحول کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے
مدھ تقسیم ہونے لگی ہے
رات نے روشنی کے در بند کر دیے ہیں
چلمنیں دبیز ہو گئی ہیں
شام
لطف و انبساط کا حریری پیرہن زیبِ تن کیے
اجالے کو اپنے کشادہ دامن میں سمیٹ کر
وصل کی وادیوں میں کھو گئی ہے



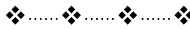
بے گھری کا دُکھ

ذہن الجھا ہوا ہے
اعصابی تناؤ میں اضافہ ہو رہا ہے
مسلسل بے دھیانی اور لا پرواہی کی وجہ سے
مکان کھنڈر بنتا جا رہا ہے
دیواریں سیلن زدہ ہیں
چھت کے بوسیدہ شہتیر
خطرے کی گھنٹیاں بجا رہے ہیں
دروازوں اور کھڑکیوں کو دیمک نے کھوکھلا کر دیا ہے
پورے مکان کا رنگ و روغن اترتا جا رہا ہے
مجھ میں اب سکت نہیں ہے
وسائل کی شدید کمی نے پریشان کر رکھا ہے
اس سال سنا ہے
بارشیں معمول سے زیادہ ہوں گی

خدشات بڑھتے جا رہے ہیں
ڈر ایک بھیانک احساس کی طرح
دماغ کو شل کر رہا ہے
یوں لگتا ہے بے گھری مقدر بن چکی ہے
اس خستہ حال مکان کی مرمت آسان نہیں
سالہا سال سے میں نے اس کی دیکھ بھال نہیں کی
غیر ضروری کاموں میں مصروف رہا
اب احساس ہوا ہے
کہ جہاں کہیں بھی توجہ کا رزق استعمال نہیں ہوتا
بدحالی یلغار کر دیتی ہے
بدحالی میں تو کوئی تعاون اور مدد بھی نہیں کرتا
سب اپنی اپنی ذات کے دائروں میں قید ہیں
کسی کو کسی کی فکر کیوں ہو
بڑھتی ہوئی خواہشات کو پورا کرنے کے جنون میں
سب بکھرے ہوئے ہیں
بے سمتی نے توانائیوں کو مرتکز نہیں رہنے دیا
زمانے کی برق رفتاری دم لینے ہی نہیں دیتی
یوں لگتا ہے کوئی چابک سے ہانک رہا ہے

مجھ سمیت سارے خواب گزیدہ
سر پکڑے بیٹھے ہیں
ہر روز نیا دن نکلتا ہے
مگر وہ ہمارے در و بام کو روشن نہیں کرتا
فطرت نے بھی انصاف کا چلن چھوڑ دیا ہے
یا ہمارا فہم
فطرت کے بھیدوں کو سمجھنے میں ناکام ہو گیا ہے
کھنڈر بنتے گھر کو دیکھ کر
پریشانی کے عالم میں
الٹے سیدھے منصوبے بناتا رہتا ہوں
ادھر ہر روز کوئی نئی اینٹ دیوار کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے
صدر دروازہ اب باقی نہیں رہا
دیواریں بھی جا بجا در بن گئے ہیں
کسی بھی ناگہانی آفت کو روکنا اب بس میں نہیں رہا
موسم اتنے شدید اور متلوّن مزاج ہیں
کہ کوئی پیش بندی کام نہیں آتی
بچوں کی بے چارگی دیکھی نہیں جاتی
لاکھ تسلیاں دیتا ہوں

مگر گلوبل چکاچوند کے سامنے
سارے حوصلے، ساری دانش
دھری کی دھری رہ جاتی ہے
امید ایک لفظ سے زیادہ
اہمیت کی حامل نہیں رہی
کہ مضمحل یقین نے امید کی روشنی مدھم کر دی ہے
میں نے کوہِ ندا کی جانب رخ کر لیا ہے
مجھے ساری کوتاہیوں کا ازالہ کرنا ہے
مجھے از سرِ نو اپنے یقین کی پرورش کرنی ہے
مجھے یہ بے گھری قبول نہیں
میری سماعت صدائے کن کی منتظر ہے



خوابوں کا رزق

ایک دیوار ہے
خدا معلوم کب کسی نے میرے سامنے کھڑی کر دی ہے
دیوار کے اس پار
وہ سب کچھ ہے جسے
میرے خوابوں کا رزق بنا دیا گیا ہے
کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے میرے خواب اب
مجھ سے روٹھنے لگے ہیں
مجھ سے شکوہ کناں ہیں
کہ میں نے دیوار کے اس پار جانے کی کوشش کیوں نہیں کی
بات صرف اتنی ہے کہ
مجھے اس پار جانے کے لیے جس نوع کی طلبگاری درکار ہے
وہ ابھی میرے نہاں خانۂ دل میں پرورش پا رہی ہے
مجھے انتظار ہے
کہ جنوں پرور طلب اپنے بال و پر سنوار لے تو اسے

اس پار جانے کی اجازت دوں
اس پار کے سارے منظر میری چشمِ تصور پر ہویدا ہیں
میں جانتا ہوں
دیوار کوئی بھی ہو رکاوٹ بنتی ہے
انسانی مزاج دیواروں کو نہیں دروازوں کو اہمیت دیتا ہے
دروازے گھٹن کم کرتے ہیں
نارسائی کے احساس کا خاتمہ کرتے ہیں
نئے امکانات کو سامنے لاتے ہیں
اہم بات یہ ہے کہ دیوار کے بغیر دروازے کا تصور اور وجود ممکن نہیں
میں نے دیوار سے دوستی کر لی ہے
اب مجھے اس کو پھلانگنا نہیں
اسے دروازے کی ضرورت کا احساس دلانا ہے
میں نے دیوار کو نئے منظر نامہ کی تشکیل کے لیے راضی کرلیا ہے
اب میری ساری توجہ
دیوار اور دَر کی باہمی رفاقت کو مستحکم کرنے پر ہے
مجھے دیارِ فکر و آگہی میں نہیں
محبت کی بارگاہ میں رہنا ہے

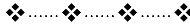
❖......❖......❖......❖

احساسِ کم مائیگی

ہموار زمین
کچے پکے سیدھے اور ہموار راستوں پر چلنے والے مسافر کو
کب معلوم تھا
بلندی اور سرفرازی کے تصوّر اور حقیقت میں کیا فرق ہے
اس نے پہلی بار
بلندی کی جانب سفر شروع کیا
تو بل کھاتی پگڈنڈیوں سے اس کا واسطہ پڑا
بلندی کی جانب آگے بڑھتے ہوئے
اسے احساس ہوا کہ اس کی رفتار بہت کم ہوگئی ہے
سانس ناہموار ہونے لگا ہے
پگڈنڈیوں نے اس کے قدموں کا جکڑ لیا ہے
سفر طے ہو رہا ہے
مگر بلندی کی جانب کم

ایک حلقہ ہے جو بل کھاتے راستوں نے تشکیل دیا ہوا ہے
وہ جب بھی سانس درست کرنے کے لیے کہیں رکا تو
اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ستانے لگ گیا
کچوکے لگانا شروع ہو گیا
اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا
کہ بلندی اور سرفرازی کے لیے
رفتار کم کرنے، سر کو مستقل جھکائے رکھنے
اور حالتِ رکوع میں رہنا کتنا ضروری ہوتا ہے
وہ آگے بڑھ رہا تھا
مگر اس کا جھکا ہوا سر
اس کے لیے بلندی کے تصور کو حیرت میں بدل رہا تھا
اس کی آرزو شدید تھی
وہ رکا نہیں، جھکے سر اور بوجھل قدموں کے ساتھ
سست روی سے بلندی کی جانب گامزن رہا
ایک تھکا دینے والی مسافت کے بعد جب وہ بلندی پر پہنچا
تو اس پر کھلا
وسعت کیا ہے
سرفرازی کیا ہے

بلندی تک پہنچنے کے لیے حالتِ رکوع میں ہونا
سر جھکانا وسعتوں تک رسائی کے لیے
انا کو عجز میں بدلنا کیوں ضروری ہے
ہر لمحہ بدلتے مناظر میں زندگی کا اعتبار کیسے قائم ہے
نشیب کتنا بے وقعت اور تہی دامن ہے
ہموار زمین اور راستے
زندگی کی معنویت سے کس قدر خالی ہیں
اس نے اپنا سانس درست کیا
جھکے ہوئے سر کو بلند کیا
اور فطرت کی بے انت وسعتوں میں کھو گیا



سرگزشت

سطح ہموار ہے نہ راستے
نشیب و فراز کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے
ڈھلوانیں ہیں گہری گھاٹیاں ہیں
سنگلاخ و بے نشاں وسعتیں ہیں
ہر سو خامشی اور ملگجی سی تاریکی کا راج ہے
سیاہی مائل چوٹیوں میں اندھے غار
خوف اور دہشت کی علامت ہیں
میری آنکھیں ایسے مناظر سے تو آشنا نہیں تھیں
میں تو خوف سے بے نیاز ایک اجلی فضا کا باسی تھا
جہاں میٹھے چشمے تھے پھول تھے پھل تھے
سبزہ تھا خوشبوئیں تھیں
ہوا کے لبوں پر ایک سرمدی لے تھی
یہ تم نے مجھے کہاں لا کر چھوڑا ہے
ایک ان چھوا اور خار و خس سے پُر

یہ ویرانہ
میرے سامنے ہے
اور میرے اندر ایک تجسّس بھرا احساس
کروٹیں لے رہا ہے
مجھے اس ویرانے میں راستہ بنانا ہے
تم نے مجھے جو نقشہ دیا ہے
اس کا تعبیری خاکہ میرے تصوّر میں مجسّم ہونے لگا ہے
مجھے اپنے ادھورے پن کی تکمیل کے لیے
اس خاکے میں رنگ بھرنے ہیں
میرے اندر اور باہر راستوں کے جنگل اگے ہوئے ہیں
میری ریاضت مشکل اور طویل ہے
تم نے نقشے میں واپسی کے سفر کی راہیں بھی
نشان زد کر دی ہیں
مجھے آگے بڑھنے اور بہت کچھ تسخیر کرنے کا جنون ہے
مگر واپس لوٹنے کی فکر بھی لاحق ہے
مجھے اس مخمصے سے نکال
میرے کردار کو ابدیّت کا کوئی نسخہ دان کر

❖......❖......❖......❖

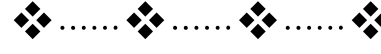
میرا سفر رائیگاں نہیں ہے

میں ایک طویل اور تاریک ٹنل کے دہانے پر کھڑا ہوں
ٹنل کی دوسری جانب روشنی کا ایک خفیف سا نقطہ
میری بصارت کو مرتکز کر رہا ہے
میرا گمان ہے
کہ دوسری جانب اُجالا ہے
طویل اور تاریک ٹنل میرے راستے میں حائل ہے
زندگی تیزی سی گزر رہی ہے
وقت کو پر لگے ہوئے ہیں
میں اکثر اس دہانے پر پہروں کھڑا رہتا ہوں
ساعتیں رائگانی اور لاحاصلی کی قبا اوڑھے
میری ذات کے تاریک کمرے میں
تواتر سے اترتی ہیں اور تاریکی کا حصہ بن جاتی ہیں
میں اپنے خوابوں کو مجتمع کرتا ہوں

اجالے کے تصور سے بصارت کو بحال رکھتا ہوں
تاریک کمرے میں دیا جلانے کا جتن کرتا ہوں
روشنی اور تاریکی کے باہمی رشتے پر غور کرتا ہوں
زندگی با اندازِ دگر مجھ پر منکشف ہونے لگتی ہے
میں نا ہونے سے ہونے کی جانب اپنے سفر کا جائزہ لیتا ہوں
تو صدیاں میری مٹھی میں سمٹ جاتی ہیں
ایک بے آب و گیاہ چٹیل میدان
میرے روبرو ہے
میرے پاؤں بوجھل ہیں
ایک انجانا سا خوف مجھے گھیرے ہوئے ہے
میں مضطرب ہوں
مگر ایک مہا خواب
جو کسی نے
مستقل میری آنکھ کا نصیب بنا دیا ہے
مجھے رکنے نہیں دیتا
میں قدم آگے بڑھاتا ہوں تو چٹیل میدان
میرا استقبال کرتا ہے

میری آنکھوں میں دمکتا ہوا خواب دیکھتا ہے
تو مسکرا اٹھتا ہے
بارشیں ہوتی ہیں سبزہ نظر کو خیرہ کرنے لگتا ہے
پھول کھلتے ہیں، خوشبو پھیلتی ہے
تو میں بھی مسکرا اٹھتا ہوں
میں نے طے کر لیا ہے
کہ میں اس طویل ٹنل کو ہر صورت عبور کروں گا
اجالے سے بغلگیر ہو کر
اپنی محرومیوں کو کامرانیوں میں بدل دوں گا
مجھے تاریکی میں نہیں رہنا
مجھے اجالے بانٹنے کے لیے تاریکی سے برسرِ پیکار رہنا ہے
میں نے نئے زاویہءِ نگاہ سے اپنے اندر کی یاترا کی ہے
مجھ پر پہلی بار کھلا ہے
کہ میری ذات میں اجالے کا ایک منجمد جہاں موجود ہے
جسے میں اپنے خواب کی توانائی
اور جذبے کی حدت سے پگھلا سکتا ہوں
میں احساسِ کامرانی سے آگے بڑھ رہا ہوں

میں نے ٹنل کا تاریک حصہ عبور کر لیا ہے
دوسری جانب
اجالا میرا انتظار کر رہا ہے
میرا سفر رائگاں نہیں ہے

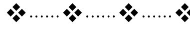


سمٹی ہوئی کتھا

سورج
دن بھر کی مسافت سر کرنے کے بعد
جب شام سے معانقہ کرتا ہے
تو شام کے رخسار گلنار ہو جاتے ہیں
اس کی آنکھوں میں ڈورے لہرانے لگتے ہیں
سورج اپنی تابنا کی تج کر کے
ایک میٹھی اور تپش آمیز رفاقت میں
ملگجی راہداریوں پر
کچھ دیر محوِ خرام رہتا ہے
شام دھیرے دھیرے سورج کو
پوری طرح ڈھانپ لیتی ہے
اسے بستر پر دراز کرتی ہے
اس کے پہلو میں لیٹ جاتی ہے

شام سورج کی میٹھی حرارت اوڑھ لیتی ہے
اس کے لبوں پر
ایک مدھ بھری مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
دن بھر کی مسافت سے پیدا ہونے والی
سورج کی ساری تھکن
اپنی پوروں میں جذب کر لیتی ہے
اور اسے ایک گہرا خمار عطا کر دیتی ہے
دونوں ایک لافانی تسکین سے سرشار ہونے لگتے ہیں
شام رات کا روپ دھار کر
اس کی رفاقت کا لطف لیتی ہے
منظر بدلتا ہے تو سورج
ایک نئے ولولے اور جذبے کے ساتھ ابھرتا ہے
اور ایک نئے دن کو
پوری آب و تاب کے ساتھ روشن کر دیتا ہے
دھرتی جگمگا اٹھتی ہے اور شام خامشی سے
کنجِ تنہائی میں جا کے سو جاتی ہے
پھر انتظار شروع ہوتا ہے
شام سمے کا،

تجدیدِ وفا کا،
زندگی کی رگوں میں روئیدگی اتارنے کا
روز وشب کا یہ سفر جاری رہتا ہے
زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ
دعوتِ نظارہ دیتی چلی جاتی ہے
وابستگی اور انسلاک کے رنگ
جب خوشبوؤں کو مس کرتے ہیں
تو انوکھی راحتیں اور ذائقے تشکیل دیتے ہیں
ملن رت مسکرا اٹھتی ہے



شاخِ بریدہ

کٹی ہوئی شاخ
سزاوارِ برگ و بار نہیں ہوتی
لیکن اس کی پوروں میں
گزرے موسموں کی کہانیوں کے حوالے موجود ہوتے ہیں
جلنے کی نوبت آئے تو
رنگ، خوشبو اور دھواں مل کر
نیا منظر تخلیق کرتے ہیں
اس نے اپنے خلوت کدہ میں
صندل کی میز پر سلیقے سے رکھے
لوبان دان کی جانب مجھے متوجہ کیا
لوبان دان سے اٹھتے
دودھیا رنگ کے مسحور کن دھوئیں کی خوشبو
میری روح میں اترتی چلی گئی

اس نے میری سرشاری دیکھ کر
بانسری اٹھائی اور راگ پہاڑی میں
سیف الملوک کا الاپ لگایا
مجھے صندل کی خوشبو، لوبان کے دھوئیں، بانسری کی لے
اور سیف الملوک کے روح پرور بولوں نے سحر زدہ کر دیا
میں شاخِ بریدہ کے ٹکڑوں میں سانس لیتی زندگی کا نظارہ کرنے لگا
مجھ پر امکانات کے کئی در وا ہوئے
لطف و انبساط کی نئی کیفیات منکشف ہوئیں
وہ میری محویت میں مخل ہوا
اور بولا
تم نے شاخِ بریدہ کو کم مایہ جانا
شاید تمہیں معلوم نہیں یہ ایک بھید ہے
کٹنا جڑنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا
بات اصل و نسل اور اساس کی ہے
یہ بھید صرف ان لوگوں پر کھلتا ہے
جو وقت کی یلغار اور مابعد یلغار کے احوال کا درک رکھتے ہوں
شاخِ بریدہ بے مایہ نہیں ہوتی

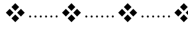
❖......❖......❖......❖

قوس

ایک انجانا خوف
ہمہ وقت میرے سامنے پھن پھیلائے کھڑا رہتا ہے
میری زندگی کے وہ لمحے
جنہیں میں خوشی کا نام دینا چاہتا ہوں
اس خوف کے باعث
میری روح کو سرشار کرنے میں ناکام رہتے ہیں
یہ خوف ختم کیوں نہیں ہوتا
میں پہروں اس سوال میں الجھا رہتا ہوں
میں ہر نعمت سے لطف اندوز ہو رہا تھا
رنگ، خوشبو، تازگی
معطر ہوائیں
ٹھنڈے چشمے، سحر انگیز آبشاریں
میرے تصرف میں تھیں

جہاں جی چاہتا تھا بے خوف آزادانہ گھومتا تھا
جو جی میں آتا کرتا تھا
میری یہ خوشی ایک حاسد سے دیکھی نہ گئی
اس نے میرے کانوں میں
گمراہی انڈیلی
مجھے اس سمت دھکیلا
جس سمت جانے سے مجھے منع کیا گیا تھا
حاسد کامیاب ہوا
مجھے بلندی سے پستیوں میں گرا دیا گیا
بلندی سے گرنے کا خوف
اسی دن سے
میرے وجود اور میری روح کا مستقل حصہ بن گیا
میں اس خوف سے نکل نہیں پاتا
میں نے بلندیوں کو کئی معنی دیے
کئی نام رکھے
مگر بلندی سے گرنے کا خوف ہمیشہ دامن گیر رہا
میری خوشیاں ادھوری رہیں
میری حالتِ زار پر فطرت کو قدرے رحم آیا تو مجھے

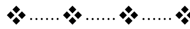
خواب، خیال اور یقین عطا کر کے
لگن اور جنوں سے آشنا کر دیا گیا
محبت کے روح پرور گیت
میری سماعت کو دان کر دیے گئے
اب بھی خوف کہیں موجود ہے
مگر اسے ہمت نہیں پڑتی کہ وہ
محبت کا حصار توڑ سکے
میرے باطن تک رسائی حاصل کر سکے
میں نے اپنی غلطی کا ازالہ کر لیا ہے
اب میں محبت کی نظمیں لکھتا ہوں
رقص بھی کرتا ہوں
گیت بھی گاتا ہوں



گنبدِ بے دَر میں صدا

ایک گنبدِ بے در میں ہوں
مدت سے ماہ وسال کی گنتی سے بے نیاز
اپنی سانسوں سے مرتب کردہ کیلنڈر سے جڑا ہوا ہوں
جب کبھی بھی کسی کو پکارتا ہوں
تو گنبد میرا تمسخر اڑانے لگتا ہے
میری پکار کوئی گنا بڑھا کر میری سماعت میں انڈیل دیتا ہے
میرا پورا وجود گونجنے لگتا ہے
وحشتیں سر اٹھانے لگتی ہیں
میں اپنی سانسوں کو پھر سے مرتب کرنے لگتا ہوں
چھت پر نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے عدسے جَڑے ہیں
کسی سعد گھڑی میں جب
ان عدسوں سے نیلگوں روشنی میرے بدن کو چھو کر
میرے لہو میں گھلنے لگتی ہے

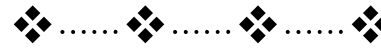
تو میری وحشت میں کمی آتی ہے
میرا وجود نیلی روشنی کا مسکن بن جاتا ہے
حیرتیں وا ہونا شروع ہوتی ہیں
ایک جہانِ تصور اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ
مجھ پر منکشف ہوتا ہے
میری پکار بامعنی ہو جاتی ہے
میری سماعت سے لبیک کی صدا ٹکراتی ہے
گنبد کی دیواروں پر ایک شبیہہ ابھرتی ہے
آنکھوں میں بصارت لوٹ آتی ہے
نیلی روشنی کے ہمراہ پورا جہانِ رنگ و بو
گنبدِ بے در میں سمٹ جاتا ہے
میں وصل کی ان گھڑیوں میں
طویل ہجر کے دکھ بھول جاتا ہوں



مراجعت

بڑی مدت کے بعد آئے ہو
مجھے یاد ہے جب تم رخصت ہو رہے تھے
چاندنی نے پورے ماحول کو اپنے حصار میں لیا ہوا تھا
رات کی رانی کے ننھے ننھے پھولوں میں پلتی خوشبو
تسلسل سے ہوا کی سانسوں میں اتر رہی تھی
ہوا سرشار تھی
میری کیفیت عجیب تھی
تمہارے جانے کا کسک آمیز احساس
مجھے بے کل کر رہا تھا
اور فطرت کی طلسماتی سندرتا کو من میں اتارنے کی آرزو
مجھے دیوانہ بنا رہی تھی
میں تمہیں روک نہیں پا رہا تھا
ایک خیال پکار بن کر

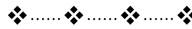
میری سماعت سے بار بار ٹکرا رہا تھا
کیا کوئی ایسے موسم میں بھی جدا ہوتا ہے
تم نہیں جانتے یہ پکار
صدائے بازگشت کی طرح مسلسل میری سماعت سے ٹکراتی رہی ہے
اب تم آئے ہو
چاندنی شب ساتھ لائے ہو نہ رات کی رانی کی مہک
تم ایسے تو نہیں تھے
تم کتنے بدل گئے ہو



معانقہ

بہار رت کی خنکی بھری بھیگی بھیگی خوشگوار ہوا
صبحِ نو کا ماتھا چوم کر
درختوں، پودوں اور بیلوں کی خشک شاخوں میں
تولیدی رس بانٹنے نکلی ہے
اس کے لبوں پر دھیمے سروں میں ملن کے گیت ہیں
خوشبو آمیز بادِ صبا بڑے اہتمام سے
مرجھائے ہوئے چہروں کو شاداب کرتی
زندگی کی مانگ میں سیندور بھر رہی ہے
اوس قطرے تازگی کا احساس لیے
مناظر کی پلکوں پر جھلملا رہے ہیں
پت جھڑ کی رخصتی مکمل ہو چکی ہے
سبزہ زمین کا سینہ چیر کر انگڑائیاں لینے لگا ہے
لہلہاتے کھیتوں نے دھرتی کا عریاں بدن ڈھانپ لیا ہے

زندگی دعوت نظارہ دے رہی ہے
لچکیلی شاخوں پر پرندے محوِ التفات ہیں
باغوں کے گوشے سرگوشیوں سے آباد ہو گئے ہیں
طلب گاری دلوں میں پرورش پا رہی ہے
آنکھوں میں مستی بھرا انتظار
چاہنے والوں کی نیندیں لے گیا ہے
سماعت آہٹوں کی کھوج میں ہے
دستکیں بند دروازوں کی جانب بڑھنے لگی ہیں
زندگی کی آنکھوں میں شرارت
اور دل میں وصل کی خواہش کروٹیں لے رہی ہے
بہار رُت ذائقے، رنگ اور خوشبوئیں تقسیم کر رہی ہے
باہمی التفات بانہوں کے گھیرے میں
معانقے کی تفہیم کر رہا ہے
نئے عہد و پیمان ہونے لگے ہیں

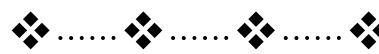


مہا کہانی

ہم ایک مہا کہانی کے کردار ہیں
کہانی اپنی مخصوص رفتار سے چلتی رہتی ہے
ہم ایک خاص وقت کے لیے سٹیج پر آتے ہیں
اپنا کردار ادا کرتے ہیں
اور سٹیج چھوڑ دیتے ہیں
ہم تماشہ گر بھی ہیں اور تماشائی بھی
اچھے کردار کی تحسین کرتے ہوئے تالیاں پیٹتے ہیں
خراب کردار کے لیے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں
جملے کستے ہیں
احمقوں کی طرح خود پہ ہنستے ہیں
کہانی کار کبھی کبھی ہمیں پرانی اقساط بھی دکھاتا ہے
تاکہ نئے کردار پرانے کرداروں سے کچھ سیکھ سکیں
جب کہانی میں یکسانیت کا تاثر پیدا ہونے لگتا ہے

تو رقص کا اہتمام کیا جاتا ہے
الاؤ روشن ہوتا ہے
تماشائی کی دلچسپی بڑھتی ہے
کہانی میں جان پڑ جاتی ہے
میں کہ کہانی کا اک کردار ہوں
کہانی کی اولین قسط دیکھنے کا متمنی ہوں
میرے مطالبے پر
بساط بچھا دی جاتی ہے
مختلف کرداروں کو مکالمے دے دیئے جاتے ہیں
سب کچھ ٹھیک لگ رہا ہوتا ہے
مگر ایک کردار باغی ہو جاتا ہے
انکار کی صدا گونجتی ہے
مکالمہ ہوتا ہے
کہانی کار باغی کو سزا سنا دیتا ہے
مگر باغی کہانی کے مرکزی کردار کا پیچھا کرتا ہے
کہانی کا مرکزی کردار
اپنی تنہائی سے اکتانے لگتا ہے
تو اسے کہانی کی روح سے ملا دیا جاتا ہے

ماحول میں شانتی اور دلکشی سے
کہانی کا رنگ روپ نکھرنے لگتا ہے
پھول کھلتے ہیں، خوشبو بکھرتی ہے
اور پوری فضا معطر ہو جاتی ہے
مگر ایک بار پھر یکسانیت کہانی پر اثر انداز ہوتی ہے
تجسّس بڑھتا ہے
انکار متحرک ہوتا ہے
تو نفی سے اثبات کی جانب ایک طویل سفر کا آغاز ہوتا ہے
کہانی دو انتہاؤں کے درمیان
چھوٹی چھوٹی ان گنت کہانیاں تخلیق کرنے لگتی ہے
ہم چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں
ایک مہا کہانی کا حصہ ہیں
ایک انکار مستقل مدِ مقابل ہے
ہم اثبات کی کھوج میں ہیں
رہگزر پر ہیں
یہی ہماری کہانی ہے



مؤرخ سے مکالمہ

مؤرخ

کچھ وقت نکال

میرے پاس بیٹھ

میں شاعر ہوں

میں اپنے عہد کو جس آنکھ سے دیکھتا ہوں

جس دل سے محسوس کرتا ہوں

وہ کسی اور کو میسّر نہیں

میری شاعری سے زیادہ کوئی حوالہ معتبر نہیں

تمہیں جو نظر آتا ہے یہ آئس برگ ہے

میرے اندر اتر

تمہیں میرے نہاں خانہ میں دور تک بکھری ہوئی

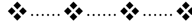
اس عہد کی کہانیوں کے عنوان

نظموں کی صورت دیکھنے کو ملیں گے

ان کہانیوں کے کردار مجھ سے مانوس ہیں
مجھ سے کچھ نہیں چھپاتے
تمہیں سچ لکھنا ہے تو
میری کہانیوں کے کرداروں سے مل
ادھر دیکھ
کوڑے کے ڈھیر سے رزق تلاش کرتے ہوئے
ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹتے ہوئے معصوم بچے
بائیں جانب نظر کر
یہ اپنے آپ میں سمٹی ہوئی کم لباسی
یہ اپنے پورے شباب پر بے کسی و بے بسی کے ہاتھوں
پژمردہ سسکتی ہوئی غریبی
جس کی جنسی اشتہا اس کے لیے طعنہ ہے
جس کی آنکھوں میں پلتے ہوئے خواب
پلکوں سے گرنے اور بکھرنے کے لیے ہیں
یہ ہر سو مجسم ہوتی ہوئی بھوک، افلاس اور بے توقیری
یہ عدل وانصاف کے ایوانوں میں
بکتا ہوا انصاف
یہ دلیلیں، یہ بحثیں، یہ گواہیاں یہ حلف نامے

یہ زندوں کے لیے تازیانے
یہ بے موت مرنے والوں کی لاشوں پر ہونے والے بین
اور لمحہ لمحہ ذلیل ہوتی ہوئی مخلوق
یہ زندگی کے روپ میں موت سے بدتر حیات
یہ مسلسل استحصال
یہ جبر یہ آہ و بکا
کیا تم میری نظموں کو تاریخ کا حصہ بناؤ گے
کیا یہ سچ لکھ پاؤ گے
یا
حکمرانوں اور ان کے حواریوں کی دی ہوئی معلومات
اور آدھے ادھورے مکروہ بیانیے کو موضوع بناؤ گے
یہ جان لو کہ تم نے سچ نہ لکھا تو تمہارا جھوٹ پکڑا جائے گا
کہ سچ میں نے رقم کر دیا ہے
تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ
جبر کے عہد میں سچ جاننے کے لیے
ایوانوں اور شہروں کا نہیں
دلوں کی بستی کا رخ کرنا ضروری ہوتا ہے
آئس برگ تو گمراہ کر دیتا ہے

غوطہ زن ہو
دوری اور بلندی پردہ ہے
قریب آ، گہرائی میں اتر اور سچ لکھ

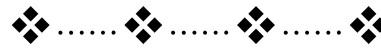


میری چشمِ تصور

جب میری چشمِ تصوّر پوری طرح وا ہوتی ہے
تو فاصلے سمٹ جاتے ہیں
مرے خیال کی رو
ان دیکھے، ان چھوئے جہانوں کی رعنائیوں کو
میرے تصور کے کینوس پر بکھیر دیتی ہے
حسن اپنی تمام جزئیات کے ساتھ میرے روبرو ہوتا ہے
میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو فطرت
میری بصارت کو نئی توانائیاں دان کرتی ہے
کسی کے کھلتے ہوئے عارض
لبوں کی خوشنما قاشیں
مدھ بھری آنکھوں کی کشش اور جواں سینے کی پھبن
میری ذات میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے
ایک پیکرِ محسوس کے سارے زاویے، قوسیں اور ابھار

میری انگلیوں کی دسترس میں آ جاتے ہیں
میرا وجود ایک گہرے لمس کے احساس سے
سرشار ہونے لگتا ہے
موسمِ بہار کی خنکی بھری ہوا
نیم وا کھڑکی سے داخل ہوتی ہے تو
پردے کی درزوں سے در آتی ہلکی ہلکی روشنی
کمرے کی فضا کو
سحر انگیز بنا دیتی ہے
بدن باہم محوِ گفتگو ہوتے ہیں تو
ایک لافانی خوشبو رگوں میں اترنے لگتی ہے
جذبے کی آنچ
بدن کی مہک اور نیم روشن کمرے کا ماحول
وابستگی کو معنی خیز بنا دیتا ہے
جوشِ مسرت میں تھرکتے جسموں کا رقص
لہو کی حدت میں اضافہ کر دیتا ہے
ایک بے خودی طاری ہونے لگتی ہے
ہم رشتگی بولتے جسموں سے حظ اٹھاتی ہے

آنکھیں بوجھل ہونا شروع ہو جاتی ہیں
تو خواب پلکوں پر دستکیں دینے لگتے ہیں
حسن و عشق کی کہانی مرتب ہونے لگتی ہے
نواحِ جاں میں پھول ہی پھول کھل اٹھتے ہیں

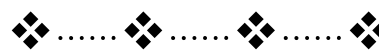


نابغہءِ عصر

فطرت نے امکانات کے رنگوں
اور صورت گری کے امکانات کو
زاویوں، قوسوں اور لکیروں کی صورت
ایک بہت بڑے کینوس پر
اپنے موقلم سے
چشمِ حیرت کے لیے آویزاں کر دیا ہے
فطرت نے
بہتے پانیوں، پر ہول جنگلوں، سنگلاخ پہاڑوں، سمندروں
اور صحراؤں کی وسعت میں
اور دھرتی کی نرم پوروں میں
فکری و تخلیقی رزق کے بیج بکھیر دیے ہیں
رات کے پچھلے پہر صدا آتی ہے
ہے کوئی جو دیکھے، سوچے اور سمجھے

اس صدا پر لبیک کہنے والے کم کم ہیں
لیکن کچھ مہان کردار ہیں
جو ناگفتنی کو گفتنی
اور ان دیکھے کو دیکھے ہوئے منظر کا روپ دینے اور
پردہ در پردہ حیرت کے عقب میں موجود دھند سے
آ گہی کشید کرنے کا کشٹ کرتے ہیں
یہی وہ لوگ ہیں
جو فطرت کے کارِ نمو پزیری میں شریک ہو کر
اپنی بصارت، بصیرت اور فکری ریاضت سے
نئے جہانوں کی چہرہ کشائی کرتے ہیں
نسلِ انسانی کا تہذیبی ارتقاء انہیں کے رتجگوں کا مرہون ہے
انہیں کی معجز نمائی سے دھرتی اپنا بانجھ پن تج کر کے مسکراتی ہے
صدیاں انہیں کی آستانہ بوسی سے معتبر ہوتی ہیں
وقت انہیں کے کارہائے نمایاں کی باز آفرینی کا طلب گار رہتا ہے
تاریخ کے اوراق انہیں کی حیات افروز سوچوں سے مستنیر ہیں
آغا جی آپ ایسے ہی نابغہ تھے
آپ کی فکری ریاضت، تخیل، علم پرور انہماک
اور آپ کی تمثال کاری نے شعور و آ گہی کے نئے دبستان کی بنیاد رکھی

ہم آپ کے لفظوں کی چھاگل سے اپنی علمی پیاس بجھاتے ہیں
اپنی کم مائیگی کو وسعت آشنا کرنے کا جتن کرتے ہیں
آغا جی!
ہم آپ کے چمن زارِ خیال کی راہداریوں میں چہل قدمی کرتے ہیں،
آپ کی فکری دانش، لہجے کی مٹھاس
اور شخصیت کی تہذیبی خوشبو سے ہم رشتہ رہتے ہیں
ہم آپ کو نہیں بھولے
مگر ہم یہ اعتراف کرتے ہیں
کہ ہم نے آپ کی علمی و فکری یافت کی پزیرائی کا حق ادا نہیں کیا
آپ کے رتجگوں کی توقیر نہیں کی
ہمیں ابھی یہ قرض ادا کرنا ہے
نہ جانے کتنی صدیاں لگ جائیں
سچ یہ ہے کہ
صدیاں تسخیر کرنے والوں کی تحسین کبھی مکمل نہیں ہوتی
آغا جی!
ہم آپ کے مقروض ہیں

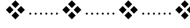


نظم میری محبوبہ ہے

نظم
موسم سرما میں میرے ساتھ بیٹھ کر
میٹھی دھوپ کا مزہ لیتی ہے
طویل سرد راتوں میں
میرے پہلو سے لگ کر مجھے محبت کی داستانیں سناتی ہے
کبھی یوسف زلیخا کا قصہ چھیڑتی ہے
کبھی ہیر رانجھا اور سوہنی مہینوال کی
دل گداز کہانی کے پرت کھولتی ہے
لفظوں کے بندھن توڑتی ہے
حرف حرف الگ کر دیتی ہے
پھر مجھے ایک ایک حرف کی صوت سے
پھوٹنے والے آہنگ سے ہم رشتہ کر دیتی ہے
بہار آتے ہی اس کے اندر ایک انوکھی مہک جاگ اٹھتی ہے

اس کے پورے بدن پر پھول کھل اٹھتے ہیں
اس کی آنکھوں میں مدھ اتر آتی ہے
محبت کی خوشبو اسے معطر رکھتی ہے
ملن کے گیتوں سے اس کا پورا وجود گونجنے لگتا ہے
میں اس کے ایک ایک انگ میں گھلی ہوئی مستی کو
اپنی روح میں اتارتا چلا جاتا ہوں
گرمی کے موسم میں اس کی اکتاہٹ جب حد سے بڑھتی ہے
تو اس کی دعائیں گھٹا کا روپ دھار لیتی ہیں
ساون میں اس کا بھیگا بدن
میری بانہوں میں سمٹ جاتا ہے
ایسے میں ایک جمال پرور تخلیقی رَو
میری ذات کا طواف کرنے لگتی ہے
یہ مجتمع ہوتی ہے
اور ایک ترتیب میں ڈھل جاتی ہے
اس کا روپ نکھر جاتا ہے
میرے اندر قربت کی خواہش سر اٹھانے لگتی ہے
میرا جی چاہتا ہے

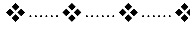
رُتیں یوں ہی مہربان رہیں
اور خوشبو یوں ہی میرے رگ و پے میں
گھلتی چلی جائے
بکھراؤ سمٹے اور
نظم کی تجسیم ہو جائے



نظم یوں ہی نہیں لکھی جاتی

حیرت جستجو کو تحریک دیتی ہے
آنکھ پر جب کوئی منظر پوری طرح نہیں کھلتا
تو پتلیوں میں ایک انجانا سا عکس رقص کرنے لگتا ہے
میں نے بارہا آنکھ کو اس صورتِ حال سے دوچار ہوتے دیکھا ہے
آنکھ عکس کی پہچان کے لیے
ہر جتن کرتی ہے
منتشر جزئیات کو سمیٹتی ہے
منظر کی تمام قاشوں کو جوڑتی ہے
ایک خاکہ سا ابھرتا ہے
بصارت چشمِ تصوّر کے در پر دستک دیتی ہے
ادھورا خاکہ اس کے حوالے کرتی ہے
نئے امکانات کا در وا ہوتا ہے
کینوس پر رنگ بکھرنے لگتے ہیں

موقلم عکس کو خال وخد عطا کرتا ہے
عکس تصویر ہونے لگتا ہے
حیرت نقاب کشائی پر آمادہ ہوتی ہے
چلمن سرکتی ہے
لفظوں کی کائنات میں تشبیہات اور استعارے جگمگانے لگتے ہیں
تخئیل پر فشاں ہوتا ہے
حسن کی تحسین کے لیے جذبہ و احساس کی پوروں میں
شاعری پلنے لگتی ہے
جستجو بار آور ہوتی ہے
تو حسن کی جلوہ گری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگتی ہے
بکھراؤ سمٹتا ہے تو
نظم ہوتی ہے

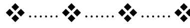


نومبر

نومبر کے نیم گرم دن اور نیم سرد راتیں
ایک منفرد سا موسم تشکیل دیتی ہیں
گہری معنویت کا حامل یہ موسم بڑا دل فریب ہے
جسم و جاں میں تحرک کی بنیاد بھی رکھتا ہے
اور ایک راحت افزا خنکی کو بھی
بدن کی پور پور میں اتار دیتا ہے
دو کیفیات کا ایک ساتھ یوں درِ احساس پر دستک دینا
طلبگاری کو مہمیز دیتا ہے
باہمی ربط کو وقار بخشتا ہے
بہت برس پہلے
ایسے ہی موسم میں
ایک خوبصورت دن اپنے جلو میں
خوشی کی نوید لے کر طلوع ہوا

ہر چہرہ دمکنے لگا
ہر سو رنگوں، خوشبوؤں کا میلہ لگ گیا
فضا میں مدھر گیتوں کے سر بکھر گئے
ایک پھول کی مہکار نے
پورے ماحول کو معطر کر دیا
سنہرے دن کی میٹھی دھوپ نے
پھول کے بطن میں ایک دائمی حرارت منتقل کر دی
زندگی کے رس بھرے ہونٹوں پر گیت اترے تو
گھر کے در و بام فرطِ انبساط سے گنگنانے لگے
آج نومبر کا وہی دن ہے
آج بھی پھول مرکزِ نگاہ ہے
آج اس کی خوشبو سے کہیں دور
کسی کی نواحِ جاں میں
عطر بیز احساس کروٹیں لے رہا ہے
عطر پاش کے تمتماتے عارض
کسی کی چشمِ تصور کو خیرہ کر رہے ہیں
کسی دل پر محبت الہام کی صورت اتر رہی ہے
نومبر ہم نے تیرا سواگت

پورے اہتمام سے کیا ہے
تیرے شب و روز کسی خاص حوالے سے معتبر ہو گئے ہیں
تیری میٹھی دھوپ، تیری سحر آفریں خنکی
ایک نسبت کے سبب انوکھی کیفیات کی حامل ہو گئی ہے
تو اب کیلنڈر پر ضوفشاں محض ایک مہینہ نہیں رہا
تو کسی کے لیے نصابِ حیات بن گیا ہے
نومبر گواہ رہنا

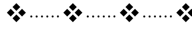


روشنی کے بغیر سندرتا جنم نہیں لیتی

بڑی مشکل سے مجھے
محل کے اندر جانے کی اجازت ملی ہے
ایک عرصہ تک میں اسے باہر سے ہی دیکھتا رہا ہوں
اس کی بیرونی دیواروں پر
بدلتے وقت اور موسموں کی تبدیلی کے اثرات
بہت نمایاں ہیں
مجھے یہ تجسّس ہمہ وقت متحرک رکھتا تھا
کہ یہ محل اندر سے کیسا ہے
میں نے قدم اندر رکھا تو مجھ پر کھلا
کہ یہ دیواروں کے حصار میں گھرا ہوا
ایک محبس ہے
کہیں نیم روشن کہیں بالکل تاریک راہداریاں ہیں
جا بجا فرش پر کسی کے بوجھل قدموں کے نشان ہیں

ایک وسیع ہال میں
نیم جان و بےنوا خواہشوں کا ہجوم ایستادہ ہے
کہیں حسرتیں بال کھولے بین کر رہی ہیں
محل جیسی فضا مفقود ہے
تخت پر بیٹھا ہوا آدمی نما ہیولا
گاہے گاہے ہانک لگاتا ہے
کسی کھڑکی کا اگر پردہ سرکتا ہے
تو تھوڑی سی روشنی در آتی ہے
یہ نامکمل یاترا
میرے تجسّس کو حیرت میں بدل دیتی ہے
یہ میں کس جہان میں آ گیا ہوں
کیا محل ایسے ہوتے ہیں
ایک دستک ہوتی ہے
اور حکم صادر ہوتا ہے کہ تمہاری یاترا کا وقت
ختم ہو گیا ہے
جلدی سے باہر آؤ
بیرونی دیواروں پر روغن کرنا ہے
برش پکڑو اور تمام دھبوں پر سفید رنگ چڑھا دو

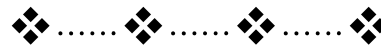
موسم بدلنے والا ہے جلدی کرو
بہت سے یاتری پہنچنے والے ہیں
مجھ پر پہلی بار منکشف ہوا ہے
کہ بصارت تو روشنی کے بغیر کچھ بھی نہیں
جب کہ بصیرت خود روشنی ہے
میں نے طے کر لیا ہے
کہ اب جب بھی موقع ملا
تو اس محل کی یاترا کے لیے بصارت کی جگہ بصیرت کو ہمراہ رکھوں گا
کہ روشنی کے بغیر تو سندرتا جنم لیتی ہے نہ نظر آتی ہے



ایک نہ تھمنے والا رقص

فکر مندی اور انتظار کی انی پر لرزتے ہوئے پل نے
سمے کے تیز رفتار قافلے کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا ہے
اسے معلوم ہے قافلے سے بچھڑنے کی کیا قیمت چکانی پڑتی ہے
وہ یہ بھی جانتا ہے کہ پیچھے رہ جانے والوں کی بصارت
قافلے کی گرد کا رزق بن جاتی ہے
مگر اس نے
محبت کا ہاتھ تھام لیا ہے
محبت کی لطیف فضا اتنی کیف آور ہے
کہ وہ ہر انجام سے بے خبر
مستی و سرشاری کی شال اوڑھے
محوِ رقص ہے
تا حدِ نگاہ دائرے ہی دائرے ہیں
اسے اپنے گرد ہر شے حالتِ رقص میں دکھائی دیتی ہے

اس نے ایک جست لگائی ہے
اب وہ ایک بڑے قافلے کا حصہ ہے
سورج، چاند، ستارے، کہکشائیں
اور نیلگوں کائناتی وسعتیں اس کے ہمراہ ہیں
روشنیوں کے دائروں میں
ایک نہ تھمنے والا رقص جاری ہے
یہ محبت کا فیض ہے
کہ اس مہا رقص میں شریک ہو کر
فکر مندی اور انتظار کی انی پر لرزتا ہوا پل
اپنی کم مائیگی بھول چکا ہے
اور فنا کے خوف سے آزاد ہو کر
زندگی کا نصاب بن گیا ہے

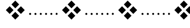


ابھی میں بہاؤ میں ہوں

میں ایک شاعر ہوں
میں ہر ایک منظر، ہر ایک تبدیلی کو
پوری توجہ، پورے احساس اور عمیق نگاہی سے دیکھنا چاہتا ہوں
میں کُل کو جزئیات سمیت اپنے تخلیقی رزق میں شامل کرنا چاہتا ہوں
مگر اس عہد کی تیز رفتاری میرے انہماک کی راہ میں رکاوٹ ہے
میری بصارت اس رفتار کا ساتھ نہیں دے پا رہی
میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے اس رفتار سے ہم رشتہ نہیں رہنا
میں نے اپنی رفتار کم کر لی ہے
میں نے لمبے لمبے سانس لینے کی مشق کی ہے
خود کو مجتمع کیا ہے
میری آنکھوں میں بصارت لو دینے لگی ہے
منظر کی تمام پرتیں میری پتلیوں پر مصور ہو گئی ہیں

ہر پرت ایک مکمل نظام ہے
اور ہر پرت کے عقب میں ایک تخلیقی اسرار ہے
میں ایک نئی دنیا میں داخل ہو گیا ہوں
میں نے ایک منظر میں ہی سارے منظر دیکھ لیے ہیں
میری بصارت اب مصنوعی آلات کی محتاج نہیں رہی
میری ذات میں ایک نئی آنکھ نے جنم لے لیا ہے
جس کی رسائی لا کی پراسرار وادی تک ہے
ہونے اور نہ ہونے کی ساری کہانی
میری بصیرت کا حصہ بن گئی ہے
ماضی حال اور مستقبل مجھ سے ہمکلام ہیں
وہ دیکھ رہا ہوں جو ابھی ہوا نہیں
وہ دیکھ چکا ہوں جو نفی اثبات کی کتھا کا حصہ ہے
جو کچھ مجھ پر منکشف ہوا ہے
اس نے مجھے سیراب کر دیا ہے
پوہ پھٹے پرندوں کے گیت سننا میرا معمول بن گیا ہے
نیلگوں آسماں کی وسعتیں میری آنکھ میں سمٹ گئی ہیں

یہ ہست کی کون سی رہگزر ہے
اسے بیان کرنا میرے لیے مشکل ہے
کہیں رکا تو داستاں نظم کر دوں گا
ابھی بہاؤ میں ہوں

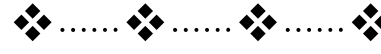


تعاقب

ایک گہرا سیاہ فولادی حصار ہے
جس نے میرے تجسّس میں اضافہ کیا ہے
میں نے کئی بار اس کی ماہیّت پر غور کیا ہے
اس حصار کی جکڑن نے
ایک عجیب سا ہیجان پیدا کر دیا ہے
اس نے مجھے اپنے اندر اترنے پر اکسایا ہے
میں نے اپنی ذات کی عمیق گہرائیوں میں
روشنی کا کھوج لگایا ہے
مگر یہ چار سو پھیلی ہوئی سیاہی
میری بصارت کے آگے دیوار بن گئی ہے
میں چاہتا ہوں
میرے اندر جو روشنی موجود ہے

وہ میری آنکھوں کا نور بن جائے
مجھے اس سیاہی کے عقب میں جھانکنے کی سہولت حاصل ہو جائے
اس نے شاید میرے ارادے کو بھانپ لیا ہے
فولادی حصار کی تہہ مزید دبیز ہو گئی ہے
وہ کون ہے
جو میری بصارت سے خوف زدہ ہے
کس نے میرے ماحول کے جملہ مظاہر کو
ایک دوسرے سے بے ربط کر دیا ہے
باہمی بے خبری کی پرورش کون کر رہا ہے
یہ فولادی باڑ کب تک تاریکی کی حفاظت کرے گی
جگنوؤں کا وجود تو ختم نہیں ہو سکتا
ان کی ٹمٹماتی روشنی اس گدلی جھالر کی سلوٹوں
اور روزنوں پر نظر رکھے ہوئے ہے
روشنی تو اپنے ہدف کو تلاش کر لیتی ہے
اور جب یلغار کرتی ہے
تو تاریکی کا وجود ختم کر دیتی ہے
مجھے لگتا ہے

اس سے پہلے کہ تاریکی پر کاری ضرب لگے
تاریکی نے پسپا ہونے کا سوچ لیا ہے
اور اپنی حرکت اور حرارت کو
نئی صبح کے سپرد کر کے
سورج کا استقبال کرنے کا ارادہ کر لیا ہے
اور شانتی اوڑھ لی ہے

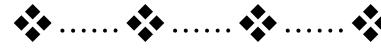


شادکامی

مسافر ایک ان دیکھی منزل کی کھوج میں
گھر سے نکلا ہے
اس کے سامنے بہت سی پگڈنڈیاں ہیں
جو اس کی حدِّ نگاہ کو عبور کر کے گہری دھند میں کھو گئی ہیں
مسافر رختِ سفر اٹھائے
اس سوچ میں گم ہے کہ کس پگڈنڈی سے سفر آغاز کرے
اسے یہ ڈر ہے کہ کہیں اس کا سفر رائیگاں نہ ہو جائے
اسے یہ بھی اندازہ نہیں کہ سفر کتنا طویل ہے
کیا اس کا رختِ سفر
اس کا ساتھ دے پائے گا
اور کیا منزل کا جو تصور اس کے ذہن میں ہے
اس کا کوئی حقیقی وجود بھی ہے

بہت سے خدشات نے اسے گھیرا ہوا ہے
مگر تجسّس کی خو اتنی مستحکم ہے
کہ وہ خود کو آگے بڑھنے سے روک نہیں پا رہا
اس نے آنکھیں بند کی ہیں
اپنے اندر اتر کر اس ہیولے کو گرفت میں لیا ہے
جسے وہ ان دیکھی منزل کہتا ہے
وہ اپنے روبرو آیا ہے
اس نے اپنے بدن کی پگڈنڈیوں کو
پہلے بار غور سے دیکھا ہے
تو اس پر کھلا ہے
کہ تمام پگڈنڈیاں جذبے اور احساس کی رَو کو تحرک پر آمادہ کرتی ہیں
ان پگڈنڈیوں پر رقص کرتے ہوئے مسافر
حیات کی گرہ کشائی کرتے چلے جاتے ہیں
رقص جاری رہتا ہے
گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں
ان دیکھے جہان احاطہءِ بصارت میں اترتے ہیں

تو زندگی کے معنی بدل جاتے ہیں
رائیگانی کا خوف ختم ہو جاتا ہے
پگڈنڈیاں شاہراہوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں
مسافر شاد کام ٹھہرتا ہے
واپس لوٹتا ہے
اور روشنی تقسیم کرتا ہے



مرکز مائل

گریز دائرے سے نکلنے

پسپا ہونے

یا شکست خوردہ ہونے کا نام نہیں

یہ ایک خفیف سی بے ضرر سی بے نیازی ہے

دائرے کی مرکز مائل کشش کے لیے

مزید توجہ اور وابستگی کا اظہار ہے

کشش میں اضافے کا مطالبہ ہے

اس نے جب یہ جانا تو اسے احساس ہوا

کہ بے نیازی کو ایک حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے

وہ پلٹا، اس نے احساس کے پیالے میں

محبت کا امرت رس گھولا

اور غٹا غٹ پی گیا

گریز کا سارا کھردرا پن کوملتا میں بدل گیا
دائرے کی قوسوں نے دامن کشادہ کیا
مرکز کی عمیق گہرائی سے
لہریں اٹھیں
تو قوسیں قوسِ قزح میں تبدیل ہو گئیں
خشک ہونٹ تر ہوئے
آنکھوں کی پتلیوں میں ملن کی آرزو جاگ اٹھی
تو سارا منظر رنگ و نور میں نہا گیا
ایک با معنی گریز نے تصویر میں رنگ بھر دیے
محبت ایسے ہی کرشماتی زایچوں میں
اپنا آپ منعکس کرتی ہے
محبت کرنے والوں کا گریز
گریز نہیں ہوتا
طلب میں وسعت، انہماک اور سرشاری کی جانب
جست بھرنے کا نقطہءِ آغاز ہوتا ہے

❖......❖......❖......❖

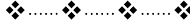
میں آزاد ہوں

میری دنیا میں
سمتوں کا کوئی تصور نہیں تھا
میں جنگلوں، وادیوں، سمندروں اور صحراؤں کی بے کنار وسعتوں میں
کبھی ہلکے کبھی تیز خرام سے
اٹھلاتی ہوئی
اپنی مرضی سے محوِ سفر رہتی تھی
جب چاہتی تھی سرد گرم لباس اوڑھ لیتی تھی
جو بھی میرے ہم رکاب ہوتا تھا
اسے میری رفتار کا ساتھ دینا پڑتا تھا
مجھے نہ جانے کیا سوجھی
میں نے وسعتوں کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ چلنے کی حامی بھر لی
میں پہلی بار سمتوں سے آشنا ہوئی

گلیوں، بازاروں چوکوں اور محلوں کے معنی مجھ پر کھلے
میں نے بستیوں اور شہروں کا رخ کیا
مجھے باور کرایا گیا کہ میری اہمیت بہت زیادہ ہے
بستیوں میں بسنے والوں کی سانسوں کا دارومدار
میرے خرامِ ناز پر ہے
میں نے خیر سگالی کے طور پر ان سمتوں کو قبول کیا
وسعتوں سے ناطہ توڑا
اور اپنی آوارہ خرامی کو گروی رکھ دیا
سانسوں کے تسلسل کو یقینی بنانے کی ذمہ داری نبھائی
مگر تم نے مجھے کیا صلہ دیا
میرا اجلا بدن میلا کر دیا
میری پوروں میں خوشبو کی جگہ تعفن بھر دیا
مجھے قیدیوں کی طرح
محبسوں میں قید کیا
تمہاری پھیلائی ہوئی کثافتیں میری سندرتا کو چاٹ گئیں
اب تم مجھ سے تقاضا کرتے ہو کہ میں پہلے کی طرح

سانسوں میں زندگی کیوں نہیں اتارتی
خوشبوئیں کیوں نہیں بانٹتی
تم بہت ظالم ہو
تم نے خود پر بھی ظلم کیا
اور مجھ سے بھی میری آزادی اور خرام چھین لیا
شاید تمہیں آزادی کا مفہوم نہیں معلوم
تم نے وسعتوں کو تج کر کے
اپنے لیے جیلیں بنائیں
جنگل سے نکل کر نئے جنگل تعمیر کیے
فولادی زنجیریں اور کڑے تیار کیے
اب تمہاری غلامی کی خُو درجہ کمال کو پہنچ چکی ہے
میرا دم گھٹ رہا ہے
مجھے یہاں سے کوچ کرنا ہے
بے کنار وسعتیں میرے انتظار میں ہیں
تم نے میری قدر نہیں کی
اپنی بنائی ہوئی دنیا میں

بے وقار پڑے رہو، سسکتے رہو
تم اب مجھے اس قید میں نہیں رکھ سکتے
میں آزاد ہوں
غلاموں کا ساتھ نہیں دے سکتی

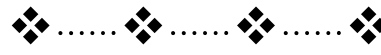


میں نے یہ سوچ لیا ہے

میں نے یہ سوچ لیا ہے کہ مجھے اب
ان پیڑوں اور پودوں کی پرورش
اور نگہداشت کی ذمہ داری قبول نہیں کرنی
جو خزاں کی یلغار کے آگے
اپنے کروفر سے دستبردار ہو جاتے ہیں
خزاں کا تسلط ہنسی خوشی قبول کر لیتے ہیں
خزاں بڑی ہنر مندی سے
ان کے لباس کو کترنوں میں تبدیل کر دیتی ہے
اور دیکھتے ہی دیکھتے انہیں بے لباس کر دیتی ہے
یہ ننگ دھڑنگ کھلے آسمان کے نیچے
بہار رت کا انتظار کرتے ہیں
مجھے اب
اُن پیڑوں اور پودوں کی حوصلہ افزائی کرنی ہے

جو خزاں رت کو خاطر میں نہیں لاتے
نہ اس کا تسلط قبول کرتے ہیں
وہ اپنے لباسِ فاخرہ کی ایک کترن پر بھی خزاں کا حق تسلیم نہیں کرتے
پوری شان سے اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں
ان کی ہر پور میں زندگی اپنی اوک سے
روئیدگی کا رس انڈیلتی ہے
وہ بہار رت کا انتظار نہیں کرتے
بہار خود ان سے گلے ملنے کے لیے
اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کو دامن میں سمیٹے
تیز قدموں سے ان کی جانب بڑھتی ہے
خزاں وقت سے پہلے اپنا بستر لپیٹ لیتی ہے
ہوا کی سانسوں میں سرخوشی گھلنے لگتی ہے
چہچہاتے ہوئے پرندے
کھلتے موسموں کے گیت گاتے ہیں
ہر زخم بھرنے لگتا ہے
ہر چاک سل جاتا ہے

دھرتی نے اپنا بانجھ پن تج کر کے
نئے پیڑوں اور پودوں کے لیے
اپنی بانہیں کشادہ کر دی ہیں
انہیں اپنی زرخیزی دان کر دی ہے
مجھے اب خزاں کا رزق بننے والے
پیڑوں اور پودوں کو الوداع کہنا ہے
بہار کے غلبہ کو یقینی بنانا ہے
مَیں نے اب سوچ لیا ہے

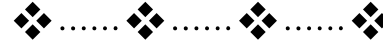


نئی شروعات

میں اس سے پہلو تہی کر نہیں سکتا
وہ میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے
میں اس کے سرد گرم رویّوں کو جھیلتا ہوں
میں شکوہ تو کرتا ہوں
مگر اس سے الگ نہیں ہو سکتا
میری سانسوں کا دار و مدار
اس کی سبک خرامی پر ہے
میں رفتار کم کر لوں تو وہ میرے لیے رکتا نہیں
اس کی یہ عادت مجھے
رائگانی کے احساس سے دو چار کر دیتی ہے
وہ مجھے مسلسل آوازیں دیتا ہے
آگے بڑھنے کا کہتا ہے

مگر میں بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں
بہت سی یادیں میرے پاؤں پکڑ لیتی ہیں
میری رفتار مزید کم ہو جاتی ہے
میں جب کبھی گہری نیند سے بیدار ہوتا ہوں
تو وہ تیز رفتار بہت آگے جا چکا ہوتا ہے
اکثر میرے حصے میں
اس کے قدموں کے نشان آتے ہیں
میں اپنی توانائیوں کو مجتمع کرتا ہوں
اور رفتار تیز کرتا ہوں
مگر اس کی رفتار مجھ سے ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے
میں نے سوچ لیا ہے
مجھے اب اس کو اپنے تصوراتی ہالے میں قید کرنا ہے
اسے تسبیح کے دانوں کی طرح مس کرنا ہے
کبھی زیرِ لب اور کبھی بلند آواز میں
اسے اپنی منزل کا پتا سمجھانا ہے
اور اسے اک نام کے ورد میں شریک کرنا ہے

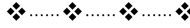
اس بار یہ بھی طے کیا ہے
کہ اس کے لمحوں کی صورت بکھرے وجود کو
اکائی میں تبدیل کرنا ہے
مجھے ماضی حال اور مستقبل کے خانوں میں
اسے تلاش نہیں کرنا
اسے دائرے کے مرکز کا پابند بنانا ہے
میں اپنا رقص ترک نہیں کر سکتا



اَن چھوئے منظر

ماہ وسال کے رتھ پر سوار
لمحوں کی برق رفتاری کو
کوئی تو روکنے کی کوشش کرے
کوئی تو ان لمحوں کو بتا پائے
یہ چاروں اور
جو ابھی تک کچھ اَن چھوئے سے منظر ہیں
یہ شکوہ کناں ہیں
کہ انہیں کیوں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے
کسی بھی آنکھ میں ان کے لیے کیوں جگہ نہیں ہے
یہ سب مناظر سراپا احتجاج ہیں
کہ کب تک انہیں نظر انداز کیا جاتا رہے گا
کوئی تو اس برق رفتاری کو لگام ڈالے

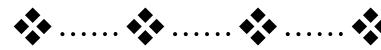
یہ مناظر ان گنت جزئیات کے حامل ہیں
ان کی ہر پرت میں تاریخ سانسیں لے رہی ہے
یہ ماہ وسال کے گرد وغبار میں لپٹے ہوئے مناظر
اگر یوں ہی بے توجہی کا شکار رہے
تو ہماری شناخت گم ہو جائے گی



ایک نظم شناس کے لیے نظم

گھٹن حد سے بڑھی تو
اپنی ذات میں معتکف طلبگاری
صدف کے ہونٹوں سے پکار بن کر
ماحول کی جکڑ بندیوں کو توڑتی
فضائے بسیط میں پھیلتی چلی گئی
لب وا ہوئے تو
احساس کی رو پر سوار ابرِ نیساں سے
ایک قطرے نے انگڑائی لی اور
نمی کو ترستے ہونٹ تر کر دیے
خدشات اور اندیشوں کی زد میں گھری صدف نے نمی کو
اپنے اندر سمیٹ لیا اور جھٹ سے اپنے ہونٹ سی لیے
طلبگاری کی پرورش شروع ہوئی تو درونِ ذات

خوابیدہ خواہشوں نے خوش رنگ پیکر میں لہریئے بنا دیئے
ایک مدت کے بعد صدف کو سیرابی کا روح پرور احساس میسّر آیا
طوفان آئے، لہریں اٹھیں لیکن
صدف کا دامن گہر کی پرورش کے لیے تخلیقی رزق فراہم کرتا رہا
کہیں ساحل پر کوئی گہر شناس منتظر تھا کہ کب
اس تخلیقی رو کی تجسیم ہو
ایک مہربان لہر اٹھی
اور گہر شناس کے دامن سے لپٹ گئی
بہار رت کا ابرِ گہر بار سرخرو ہوا
اور مسکراتا ہوا واپس لوٹ گیا
ہوائیں محبت کا دیباچہ لکھنے میں مصروف ہو گئیں
نظموں کا جہاں آباد ہو گیا

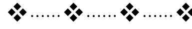


رت بدل رہی ہے

کٹی پتنگ کی طرح ہوا کے رحم و کرم پر ہیں
ہوا بے سمتی کا شکار ہے
ہم اپنی سمت کا تعین نہیں کر پا رہے
ہوا نے ہمارے لیے
انگنت خدشے اور اندیشے پال رکھے ہیں
کچھ خود ساختہ ہیں
کچھ گرد و پیش کی کروٹوں سے اخذ کردہ ہیں
جن کے معنی و تشریح کی حقیقت سوائے ہوا کے کسی کو معلوم نہیں
مسلسل بے سمتی نے
ہوا کو پاگل پن کی دہلیز پر لا کھڑا کیا ہے
وقفے وقفے سے آگ لگاتی ہے شعلے بھڑکاتی ہے
تپش بڑھتی ہے

تو اپنے پروں کو بھگو لیتی ہے
کچھ وقت کے لیے رکی ہوئی معلوم ہوتی ہے
جیسے تھک گئی ہو
مگر پھر اپنے داخلی اضطراب کو کم کرنے کے لیے
اپنی رفتار تیز کرتی ہے
سب کچھ روندتی چلی جاتی ہے
کبھی کبھی لگتا ہے ہوا کا پاگل پن ہوا کا پیدا کردہ نہیں ہے
کہیں کوئی ہے
جو اس کی سمتیں بدلتا رہتا ہے
کسی نے اسے دھول اڑانے
اور منظروں پر غبار پھیلانے کے کام پر لگایا ہوا ہے
رت بدل رہی ہے
ہوا کی قوت اور گرفت کم ہو رہی ہے
کٹی پتنگیں باہمی انسلاک سے
فضا میں نیا منظر نامہ تشکیل دے رہی ہیں
ممکن ہے ہوا کی گھٹن ہی اس کی گھٹن کا علاج بن جائے
اس کی وحشت کم ہو جائے
بے سمتی کسی سمت کا انتخاب کر لے

آوارہ خرامی کو قرار آ جائے
پرندے گھونسلوں میں لوٹ آئیں
ہوا کا عریاں بدن
رنگوں اور خوشبوؤں سے ڈھک جائے



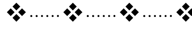
واپسی

اس نے تیز چبھتی ہوئی روشنی سے
خود کو بچانے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں
سر جھکا لیا
خود کو خود میں گم کرنے کی اس کوشش میں
وہ لمحہ ءِ موجود سے کٹ گیا
اس کی انکھیں بند ہوئیں تو
بصارت نے اندر کی جانب اپنی کھڑکی کھول لی
گھڑی کی سوئیاں الٹا چلنا شروع ہو گئیں
اس نے گہری تاریک سرنگ میں اترنے کے لیے
رفتار کم کر دی
وہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھا
تاریکی نے اس کا راستہ روکا

لیکن وہ رکا نہیں
گلی میں کھیلتے بچوں نے اسے دیکھا
انہوں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا
اور بے اعتنائی سے اپنا منہ دوسری جانب موڑ لیا
وہ شکست خوردہ آگے بڑھا
سکول سے چھٹی ہو چکی تھی
بچے اٹھکیلیاں کرتے
ایک دوجے سے آگے نکل جانے کے لیے
سکول بس کی جانب بھاگ رہے تھے
مگر نہ جانے کیوں وہ اکیلا
سب سے الگ اپنے میلے اور خستہ بدن میں سمٹا ہوا
ہر کسی کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا
وہ خود کو اجنبی محسوس کر رہا تھا
اس نے اپنے کمزور بدن کو تھپکی دی
اپنی ہمت کو مجتمع کیا
اور گھر کی جانب پیدل روانہ ہو گیا
اسے تھکن اور بھوک نے نڈھال کر دیا
وہ بستر پر ڈھیر ہو گیا

گھڑی کی ٹک ٹک اسے مسلسل سنائی دیتی رہی
لیکن وہ اب اسے مزید الٹا گھومتا دیکھنا نہیں چاہتا تھا
ماہ وسال کی کروٹوں میں اسے
کوئی ایک پل بھی ایسا نظر نہ آیا
جسے وہ حرزِ جاں بنا لیتا
اسے یوں لگا جیسے
جس لمحہ ءِ موجود سے آنکھیں چرا کر وہ
اس تاریک سرنگ میں اترا تھا
یہ سرنگ تو کبھی بھی اس کے لیے
روشن یا نیم روشن نہیں رہی
ایک مستقل تاریکی ہی مسلط رہی ہے
اس نے آنکھیں کھول لیں، جھکا ہوا سر اٹھایا
اور رائیگانی کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا
اس نے طے کر لیا کہ وہ اب
ہر پل سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کرے گا
راحتیں سمیٹے گا
اور زندگی کی رفتار سے خود کو ہم رشتہ رکھے گا
ہر نئی صبح کا خوش دلی سے استقبال کرے گا

اس نے زندگی کی حقیقت جان لی تھی
اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ
اپنے ماضی کو کبھی اجازت نہیں دے گا
کہ وہ اس کے حال کو نگل جائے



یوسف خالد کی تخلیقات

شعری مجموعے :

(1)۔ ''زرد موسم کا عذاب'' (1991) (غزلیں، قطعات، نظمیں)
مکتبۂ فکر و خیال، 172 ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور
مطبع: ثنائی پریس، سرگودھا

(2)۔ ''ابھی آنکھیں سلامت ہیں'' (2009) (نظمیں)
نقش گر، راولپنڈی
مطبع: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی

(3)۔ ''ہوا کو بات کرنے دیں''(2012) (غزلیں، نظمیں)
عکس پبلیکیشنز، لاہور - سرگودھا
مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور

(4)۔ ''خواب سفر کا رستہ''(2015) (نظمیں)
مثال پبلیکیشنز، فیصل آباد

(5) ۔ ''اسے تصویر کرنا ہے''(2017) (نظمیں، غزلیں)
سانجھ پبلیکیشنز، لاہور
مطبع: مکتبہ جدید، لاہور

(6)۔ ''قوسِ خیال''(2020) (قطعات)
ماورا بکس، لاہور
مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

(7)۔ ''رنگ خوشبو مرا حوالہ ہے''(2021) (نظمیں، غزلیں)
حرف زاد پبلیکیشنز، اسلام آباد - کراچی

(8)۔ ''سمے کا دھارا'' (2022) (نثری نظمیں)
مثال پبلیکیشنز، فیصل آباد
مطبع: سلیم نواز پرنٹنگ پریس

(9)۔ ''خوابوں کے حاشیے پر'' (2023) (قطعات)
ماہوزا، فیصل آباد
مطبع: زیدی ڈیجیٹل پرنٹنگ، فیصل آباد

(10)۔ ''تہی دامن نہیں ہیں ہم'' (2024) (قطعات)
ماہوزا، فیصل آباد
مطبع: زیدی ڈیجیٹل پرنٹنگ، فیصل آباد

(11)۔ ''تم محبت خرید لائے ہو''
(ڈاکٹر یونس خیال کے اشعار اور نظموں سے انتخاب کا تنقیدی جائزہ)
مرتبہ: یوسف خالد (2024)
ماہوزا، فیصل آباد
مطبع: زیدی ڈیجیٹل پرنٹنگ، فیصل آباد

یوسف خالد کے فکر و فن پر لکھی گئی کتابیں اور تحقیقی و تنقیدی کام:

(1)۔ ''نقطے''
(یوسف خالد کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے ناقدین کی آراء)
مرتبہ: یونس خیال (1990)

(2)۔ ''یوسف خالد کی تخلیقی جہات''
(یوسف خالد کی شخصیت اور فن پر معروف ناقدین کے مضامین کا مجموعہ)
مرتبہ: عابد خورشید
ناشر: وجدان پبلیکیشنز لاہور، 2016

(3) ۔ ''میں حرفوں سے عبارت ہوں''
(صاحبِ طرز شاعر یوسف خالد کی منتخب نظمیں)
مرتبہ: دلاور علی آزر (فروری 2021)
نایاب پبلی کیشنز، لاہور

(4)۔ ''نقد و نظر''
یوسف خالد کی نثری نظمیں (نامور ناقدین کی نظر میں) (2024)
ترتیب و تدوین: ذوالفقار احسن
ماہوزا، فیصل آباد

تحقیقی و تجزیاتی مقالے:

(1)۔ ''یوسف خالد شخصیت اور فن''
تنقیدی و تحقیقی مقالہ برائے ایم فل، یونیورسٹی آف سرگودھا
اسکالر: حافظہ ظلِ ہما (2016 -- 2014)
نگرانِ کار: پروفیسر طارق حبیب (شعبۂ اردو یونیورسٹی آف سرگودھا)

(2)۔ ''یوسف خالد کی نظم گوئی''
تنقیدی و تحقیقی مطالعہ برائے ایم فل
مقالہ نگار: ساجد خان (2019)
نگران: پروفیسر ڈاکٹر مطاہر شاہ (ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ)

(3)۔ ''یوسف خالد کی شاعری میں بکھرتے سماج کے عناصر''
مقالہ ایم اے
مقالہ نگار - زنیرہ صبحین (2020 -- 2018)
نگران - ڈاکٹر زاہد منیر عامر (اورینٹل کالج یونیورسٹی آف پنجاب لاہور)

(4)۔ ”مقالہ تحقیق برائے بی ایس اردو“
" سمے کا دھارا " فکری وفنی جائزہ
مقالہ نگار: محمد عاقب (سیشن 2023 --- 2019)
نگران ڈاکٹر - عابد خورشید شعبہءِ اردو (غازی یونیورسٹی ڈیرہ غازی خان)

(5)۔ ”شعری مجموعہ " خواب سفر کا رستہ " از یوسف خالد“
تجزیاتی مطالعہ
مقالہ برائے بی ایس اردو 4 سالہ پروگرام (سیشن 2023 --2019)
مقالہ نگار: سید عدنان گیلانی
نگرانِ مقالہ: پروفیسر ڈاکٹر عقیلہ بشیر (شعبہءِ اردو بہاءالدین یونیورسٹی ملتان)

(6)۔ ”شعری مجموعہ " رنگ خوشبو مرا حوالہ ہے " از یوسف خالد“
”تجزیاتی مطالعہ“
مقالہ برائے بی ایس اردو (چار سالہ پروگرام)
مقالہ نگار: محمد احمد
نگرانِ مقالہ: ڈاکٹر محمد آصف (شعبہءِ اردو بہاءالدین یونیورسٹی ملتان)

(7)۔ ”یوسف خالد کی غزل گوئی کا فکری وفنی جائزہ“
تحقیقی مقالہ برائے ایم فل (2023 --2021)
شعبہءِ اُردو و اقبالیات
مقالہ نگار: نادیہ فیاض
نگران: پروفیسر ڈاکٹر لیاقت علی (اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور)

(8)۔ ”شعری مجموعہ " خوابوں کے حاشیے پر " از یوسف خالد“
فکری وفنی جائزہ
تحقیقی وتنقیدی مطالعہ برائے بی ایس اردو (سیشن 2024 - 2020)
مقالہ نگار: شہر بانو
نگرانِ مقالہ: مسز فرزانہ علی لکچرار شعبہءِ اردو (گورنمنٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، وہاڑی)

(9)۔ ''یوسف خالد کی شاعری میں سماجی حقائق کی عکاسی''

مقالہ برائے ایم ایس اردو (ریگولر) (سیشن 2023-2021)

مقالہ نگار: اقراء نصر اللہ

نگران مقالہ: ڈاکٹر سبینہ اویس ایسوسی ایٹ پروفیسر

شعبہءِ اردو (گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی سیالکوٹ)

(10)۔ **''یوسف خالد کی کتاب'' ابھی آنکھیں سلامت ہیں'' کا فکری وفنی جائزہ''**

تحقیقی مقالہ برائے بی ایس اردو (چار سالہ پروگرام)

مقالہ نگار: نعمان خان (سیشن 2023 - 2019)

نگران مقالہ: ساجد خان لیکچرار

شعبہءِ اردو (گورنمنٹ ڈگری کالج ممش خیل بنوں)

(ملحقہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی بنوں)

یادداشت

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....

....



رقص کرتے رہو

ابھی لوٹا ہوں
ایک ایسے سفر سے واپسی ہوئی ہے
جہاں راستوں کی بھیڑ میں
بے سمتی کا جنگل اگا ہوا تھا
مسافر کے مقدر میں تھکن اور رائیگانی کے احساس
کے سوا کچھ نہ تھا
پر پیچ راستوں میں سمتیں گم ہو گئی تھیں
فاصلہ طے ہوتا تھا مگر کم نہیں ہوتا تھا
ایک حیرت مسلسل پیچھا کرتی تھی
شاید یہ دائرے کا سفر تھا
ہر قدم پہلے سے اٹھائے گئے قدموں پر پڑتا تھا
ہر نئی صبح قدم بہ قدم
ایک نئی صبح تک کا سفر کرتی
اور پھر گزشتہ صبح کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوتی
مسافر کسی حیرت کدے میں تھا
دائرے کا سرا نہیں ملتا تھا
سرا ملتا تو سفر مکمل ہوتا
تھکن سے چور مسافر کی آنکھ لگی
تو اس پر کھلا
کہ حاصل کا تصور وہم ہے
جستجو اور سفر ہی اصل حیات ہے
دائرہ ٹوٹا تو سفر رک جائے گا
رقص تھم جائے گا
انتشار اور ٹکراؤ سب کچھ ختم کر دے گا
دائرے کو ٹوٹنے نہ دو
رقص کرتے رہو

یوسف خالد

قائم شُدہ
1981ء
ماہنامہ
اہلِ قلم کا اشاعتی ادارہ
پوسٹ بکس نمبر 25، فیصل آباد
+92 300 6619124
+92 41 2645380